مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۃ یٰسٓ —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	.....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	.....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	.....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	.....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	.....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	.....	مئی 2009ء
مطبع	.....	باقر پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظامِ عدل وحریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی وعنبر فشانی کی وہ لالہ ویاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی وسماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ وتابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن وزیبائی جن کی حقیقی آب وتاب کو ان کے ستائش گروں کی غلوآمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال وجمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب وتاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق' دل بند و راہ مصطفیؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔ اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔ اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو
آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست
رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات سورۂ یٰس

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پیش لفظ 13

پہلا باب: **سورۃ یٰسٓ** (آیات 1 تا 10)

سورۃ یٰسٓ جیسے حیات آفرین پیغام کے متعلق

ہمارا مرگ آفرینِ تصور 15

یٰسین اور حروفِ مقطعات 16

یٰسین یعنی تباہ حال انسانیت کو سہارا دینے والی عظیم شخصیت 17

لفظ انسان کے بنیادی معنیٰ ''دوسروں کو سہارا دینے والا'' 18

خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرمؐ کے رسول ہونے کی

شہادت خود قرآن حکیم کی تعلیم ہے 18

اس کرّہ ارض پر قرآنِ حکیم سے بڑا کوئی معجزہ نہیں 19

قرآن حکیم تیئس سال میں نازل ہونے والی وہ

کتاب ہے جس کا ایک ایک حرف حکمت پر مبنی ہے 20

قرآنِ حکیم اپنے ہاں سزا کی بجائے جزا کا تصور پیش کرتا'

جسے کسی عمل کا فطری نتیجہ کہا جاتا ہے 21

انسانی زندگی میں آگہی کی اہمیت 21

زبان کے لحاظ سے عرب اقوام کی ذہنی سطح 22

قبرستان میں دی گئی اذان کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتی 23

اگر کسی قوم کو راہ راست پر لانا مقصود ہو تو اسے اس کے

آخری سانس تک بچانے کی سوچ پیدا کرو 24

ہم اپنی موجودہ ذہنی پستی اور زبوں حالی کو کیونکر ختم نہیں کر سکے؟ 24

اختیار کیا ہوا غلط راستہ مسافر کو کبھی منزل تک نہیں پہنچا سکتا 25

مُردہ قوم کو زندگی عطا کرنے کے لیے قرآن ایک نسخۂ کیمیا ہے

جس کا مقصد مُردوں کے سرہانے پڑھنا نہیں ہے' عمل کرنا ہے 25

تاریک راستوں کی نشاندہی جنہیں ترک کیے بغیر انسان

صراطِ مستقیم کی طرف رجوع کر ہی نہیں سکتا 26

قوم کو زندگی بخشنے کے لیے' قرآنِ حکیم کے فلسفہ حیات کی

اہمیت کو سمجھنے کی تڑپ پہلے پیدا کرنا ہوگی 27

مستعار لیے ہوئے تصورات کے تمام نشانات کو مٹا کر

ہی جہانِ نو پیدا ہوگا 27

نبی اکرمؐ کی تیرہ سالہ زندگی کی تگ و تاز اور کشمکشِ حیات

کے عملی پروگرام کا مقصد ایک بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنانا تھا 28

مردہ قوموں کی برومندی اور حیاتِ نو کے لیے نبی اکرمؐ کی

حیات ایک ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے 29

حدِ بشریت صبغت اللہ کی ایک محسوس مثال آپ کی ذات تھی 30

نبی اکرمؐ کی ذات کے لیے لفظ مزمل کا قرآنی مفہوم 30
حضور نبی اکرمؐ سے پہلے عربوں کی معاشرتی اور تمدنی زندگی
کی حالت، اسلامی نظام کی طرف دعوت اور بنیادی ترامیم
قرآنِ حکیم کے نزدیک قرآنی نظامِ حیات کے قیام
کے لیے انسان سازی کی تشکیل قدمِ اول ہے 32
منزل تک پہنچنے کے لیے کسی مخلص ساتھی کا ہم رِقاب ہونا
ضروری ہے 33
فرقہ اہل قرآن کے نزدیک صلوٰۃ کے تصور کی نوعیت 33
میکانکی طور پر ہر فرقے کی نماز کا طریق الگ الگ ہے 34
انسانوں کے اندر روح پھونکنے کا کام خدا تعالیٰ نے
انسانوں کے سپرد کر دیا ہے 34
انسانوں میں سے انسان کو پرکھنے کا طریق 34
آج ہماری حالت ظہورِ اسلام سے پہلے عرب جیسے لوگوں کی سی ہے 35
اس کرّہِ ارض پر انسانی زندگی کا وجود صرف انسانیت کے
زیور سے ہی آراستہ ہے 36
رسول اکرمؐ کی تعلیم کا پہلا مرحلہ: دلیل و براہین لانا ہے 36
بینات سے مطمئن ہونے والوں کے لیے دوسرا مرحلہ:
ضابطۂ قانون کی صداقت کو ماننا ہے 36
دلائل و براہین پر مبنی تعلیم کے بعد تیسرا مرحلہ:
میزان عدل کا قیام اور شمشیر خارہ شگاف کا مقام 37
واضح دلائل و براہین کو نہ ماننے والوں کے متعلق خدا کا ارشاد 37
تقلید پرستی انسانی عقل کو ماؤف کر دیتی ہے تو پھر جہالت
کا طوق اس کی گردن میں لٹکا دیا جاتا ہے 38

دوسرا باب: **سورۃ یٰسٓ** (آیات 11 تا 27)
قرآنِ حکیم مُردوں کو زندہ کرنے کے لیے آیا تھا، زندوں
کو موت سے ہم کنار کرنے کے لیے نہیں 41
قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں اطاعت کی بجائے اتباع
کا لفظ استعمال کیا ہے 42
ہمارے ہاں کے تراجم نے قرآنِ حکیم کا مفہوم مسخ ہی نہیں
کیا بلکہ اس کو اُلٹ کر بھی رکھ دیا ہے 42
ایمان بالغیب کا مفہوم کیا ہے؟ 43
انسانی ذات کو سب سے زیادہ پامال کرنے والی شے
خوف و حزن ہے 43
قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق نیز خشیت کا مفہوم 44
کسی عمل کے نتیجے کے متعلق احساس ہونا ہی اصل شے ہے 45
اجر کریم کا قرآنی مفہوم اور رزق حلال اور رزق حرام
میں فرق کی نوعیت 45
سورۃ یٰسٓ میں دیا گیا پروگرام تو مردے کو زندگی عطا کرنے والا ہے 46
اقبالؒ کے نزدیک زندگی کا قرآنی مفہوم 46
انسانی زندگی کا بدترین عذاب اس قوم کے لیے ہے
جس میں احترامِ آدمیت باقی نہیں رہتا 47
ہمارے ہاں کامیاب زندگی ''عزت'' کی نوکری
اور کھانے پینے کی اسودہ حالی کو تصور کیا جاتا ہے 47
قرآنِ حکیم اس حیوانی زندگی کو کفر قرار دیتا ہے 48
کفر اور ایمان کا فرق حیوانی سطح کی بجائے انسانی سطح
کو پیش نظر رکھنے سے ہوتا ہے 49

ہر روز طلوع ہونے والا سورج فکرِ قرآنی کی محکمیت
اور حاکمیت کی نوید لیے ہوئے ہوتا ہے 49
انسان کے لیے اس کرہ ارض پر سنگین ترین مسئلہ روٹی کا
اور تحفظ کا مسئلہ ہے 50
قرآنِ حکیم نے چودہ سو سال پیشتر روٹی کے
اس مسئلہ کی اہمیت کو پیش کر دیا تھا 50
قرآنِ حکیم کا پہلا لفظ ''رب'' روٹی کے تقاضوں کی
اہمیت کو جاننے کے لیے کافی ہے 52
خاک کے ان پردوں میں چھپی ہوئی انسانی ذات کی
قدر و منزلت اور اس کی نشو و نما کے تقاضوں کے پیش
نظر احترامِ آدمیت کی تاکید 52
انسانی سطح زندگی تک پہنچ جانے کے بعد دوسری منزل
کا تعارف اور اس کی اہمیت کی وضاحت 53
جس کے ہاتھ میں شمع قرآنی ہو اس کا تو فریضہ عالم گیر
سطح پر راستوں کو روشن کرنا قرار پاتا ہے 54
تقلید پرستی نے ہمیشہ ماضی کو روشن اور مستقبل کو تاریک کیا ہے 54
انسانی معاشرے کی تاریک رات کو طول دینے
والے مجرموں کے سرغنوں کی سازشیں 55
قوم کی نفسیات کو تبدیل کیے بغیر طرزِ زندگی میں
تبدیلی پیدا ہو ہی نہیں سکتی 55
حال ہو یا مستقبل، قوموں کی عزت و احترام کا ملکہ
ان کے چھوڑے ہوئے نقوش پر ہی ثبت ہوتا ہے 56
زندگی کی کامیابی کا تمام تر دار و مدار تو خیر و شر کے
اس معیار پر ہے جو قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں مقرر کر رکھا ہے 56
سورۃ یٰسٓ میں ''سات مبینیں'' کے تحت قرآن حکیم کی
تلاوت کے ذکر کا تصور 57
انسان کا ہر عمل اس کا امام ہوتا ہے (آگے آگے چلنے والا)
نیز آگاہ رکھنے والا اور نگرانی کرنے والا 57
انسان کا ہر عمل اس کے اعمال کی اُٹھنے والی دیوار کا ردّا ہوتا ہے 58
خدا تعالیٰ کی طرف سے ضابطۂ حیات مل جانے کے
باوجود قوموں کی حالت 59
قرآنِ حکیم نے تو رسالت مآبؐ کو بھی بشر کہا ہے 59
ہر انسان کا اعمال نامہ اس کے گلے میں لٹکا ہوگا 61
قرآنِ حکیم کی دعوت دینے والوں کا حشر 61
ہر انسان کی شخصیت اس کے اعمال کا عکس ہوتی ہے،
ورنہ نہ انسان منحوس ہوتا ہے اور نہ مسعود 61
انسانیت کے لحاظ سے انگریز حکمران قوم کی نفسیاتی کیفیت،
ملوکیت کی ترجمان تھی 62
انبیائے کرام کا اسوۂ حسنہ یہ تھا کہ وہ اپنی کسی بات کا
معاوضہ نہیں مانگتے تھے 63
ہر داعی یا مبلغ کے لیے دو شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہے 63
کسی کے خلاف کیا گیا جرم تو وہ معاف کر دے گا لیکن
خود سنکھیا کھانے کا جرم کون معاف کرے گا 64
آخری وقت پر موت کو دیکھتے ہوئے فرعون کا ایمان لانا، کچھ کام نہ آیا 64
قرآن حکیم تو اپنی تعلیم کو بڑے حکیمانہ پیرائے میں بیان کرتا ہے 65
فکرِ قرآن انسان میں بڑی بلند ظرفی پیدا کر دیتی ہے 65

تیسرا باب: سورۃ یٰسٓ (آیات 28 تا 44)

آسمانوں سے فرشتوں کے اترنے کے تصور کی حقیقت و ماہیت 67
کعبہ پر حملہ کے سلسلہ میں ابابیلوں کی کنکریوں کے افسانے
کی حقیقت اور قرآن کا اندازِ بیان 68
مجرم کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے سلسلہ
میں قرآنِ حکیم کی انقلاب آفریں راہنمائی 68
جرم کے باوجود مجرم کے لیے تکریمِ انسانیت کے تصور کو
نظر انداز نہیں کیا جاسکتا 70
زندگی بھر کی اذیت ناکیوں کے باوجود نبی اکرمؐ کی
کریمانہ کیفیت میں کچھ بھی فرق پیدا نہیں ہوا 70
قرآنِ حکیم مجرم سے نفرت کی بجائے اس سے ہمدردی کا سبق دیتا ہے 71
عیسائیت کے ہاں رحم کا مفہوم قرآن حکیم کے تصور سے مختلف ہے 72
خدا تعالیٰ کی ذات بھی قوموں کی تباہی پر افسوس کا ہی اظہار کرتی ہے 73
قرآنِ حکیم کی طرف سے انسانی نفسیات کا قائم
کردہ معیار اور جرم و سزا کے فلسفے کی وضاحت 73
قرآنِ حکیم، شرف انسانیت کو مجرم کی لغزش سے جدا نہیں کرتا 74
تاریخ شاہد ہے کہ انسان کا ہر قدم مکافاتِ عمل کی طرف اُٹھ رہا ہوتا ہے 75
سورۃ یٰسٓ خاص طور پر حیاتِ نو کے رموز اپنے اندر لیے ہوئے ہے 75
خودی کی حیات آفرینیوں سے لطف اندوز ہونے کا طریق 76
خدا اور بندے کے درمیان رفاقت کی ایک مثال اور قرآن
کے معاشی نظام کی وضاحت 76
خیرات کے طور پر کچھ دینے اور کچھ لینے کا تصور،
انسانی نفسیات کو سخت گیر اور پژمردہ کر دیتا ہے 78
انسانی زندگی کے نظم و نسق کو ترتیب دینے کے لیے
خارجی کائنات کی مثال پیش کرنے کی وجہ 78
قرآنِ حکیم کے کائناتی حقائق کو سمجھنے کے سلسلہ میں اہل
یورپ کی ریسرچ نے ہمارے لیے بڑی آسانی پیدا کر دی ہے 79
چودہ سو سال پہلے کائناتی سّروں کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد
اور لفظ تسبیح کا مفہوم 79
سائنسی انکشافات کے سلسلہ میں ڈاکٹر بوکائے کی طرف
سے لکھی جانے والی کتاب کا تعارف 80
ڈاکٹر مورس بوکائے کی نظر میں لفظ ''سبح'' کی ریسرچ اور اس کا مفہوم 81
ڈاکٹر بوکائے کا بارگاہِ رسالت میں نذرانہ عقیدت
اور قرآن حکیم کی عظمت کا اعتراف 81
تحقیقاتِ سماوی کے بعد ارض کی تحقیق کے متعلق انکشافات 85
انسانی معاشرے میں خارجی تبدیلی کا تمام تر دارومدار
انسان کی نفسیاتی تبدیلی پر منحصر ہوتا ہے 81
انسانی معاشرے کی استقامت کے لیے دو سنہرے ابدی اصول:
قانون کا احترام اور قانون نافذ کرنے والے کی سیرت پر اعتماد 86
تغیرِ نفس دراصل انسانی ذہنیت کی تبدیلی کا دوسرا نام ہے
اور یہ چیز کرھاً پیدا نہیں ہوتی 86

چوتھا باب: سورۃ یٰسٓ (آیات 45 تا 59)

دینِ خداوندی کی تمام تر بنیاد قانونِ مکافاتِ عمل پر استوار ہوتی ہے 88
خدا کی طرف سے دیئے گئے انسانی قانون اسی طرح
غیر متبدل اور موثر ہیں جس طرح خارجی کائنات کے قوانین 89

قرآنِ حکیم نے یہ تمام مثالیں صبغت اللہ کا مفہوم سمجھانے کے لیے ہی پیش کیں ہیں 92

انسانی زندگی میں قرآنی اصولوں کے تحت پیدا ہونے والا انقلاب بے مثل انقلاب ہوتا ہے 92

مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان تقدیر کے عقیدے نے ہی پہنچا ہے 93

تقدیر کا عقیدہ گہری سازش کہاں سے وارد ہوئی اور پھر یہ بتدریج ہمارے ایمان کا جز بن گئی 93

سید سلیمان ندوی مرحوم کا تقدیر کے عقیدے پر کیے گئے اعتراض کا جواب 94

استبداد اور ملوکیت کی حکمرانی قائم رکھنے کے لیے مذہب کا پلیٹ فارم بڑا کامیاب ثابت ہوتا ہے 95

رزق خدا نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے: کفار کا قول 96

اگر انسانوں کو خدا نے گمراہ ہی کرنا ہوتا تو وہ اپنی طرف سے کوئی کتابِ ہدایت نازل ہی نہ کرتا 96

ذاتِ خداوندی کلی اختیارات کے باوجود انسان کو دی ہوئی آزادی میں دخل اندازی نہیں کرتی 97

دین کی گھاٹی پہاڑ پر چڑھنے کے مترادف ہے 98

دینِ خداوندی کا پہلا قدم ''محکوم کے گلے سے غلامی کا طوق اتارنا ہے'' 98

دین کے میدان کا دوسرا قدم رزق کی فراوانی ہے 99

دین کی آئیڈیالوجی میں کوئی شخص اپنے آپ کو تنہا محسوس نہیں کرے گا: دین کا تیسرا قدم 99

اپنی ذمہ داری اور غلطیوں کو خدا پر ڈال دینا' انسانی اختیار و ارادہ کی نعمت سے انکار کرنا ہے 99

غلط معاشرے میں جب تباہی آتی ہے تو پھر چاروں طرف چیخوں کی آواز سنائی دیتی ہے 100

کوئی انسان اس مادی زندگی کے اندر جہانِ فردا کی زندگی کا ادراک نہیں کر سکتا 101

اس زندگی کے بعد آنے والی زندگی میں پیکرِ انسانی میں نئی توانائیاں پھونک دی جائیں گی 101

جہانِ فردا میں زندگی کا ہر عمل' جو دوسروں سے چھپا رکھا تھا' واضح ہو کر سب کے سامنے آجائے گا 101

اس بھری محفل میں شرمندگی سے بچنے کا علاج 102

زندگی سے زندگی تک کے درمیانی مرقد کے وقفے کی کیفیت 103

موت کے بعد کا نظام عدل اور انسان کی ذہنی کیفیت 103

اس میدانِ کارزار میں ہر شخص کو اس کے ہر عمل کا صلہ ضرور ملے گا 104

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں سزا کی بجائے جزا یا صلہ کا تصور پیش کیا ہے 105

ہمارے ہاں جنت کا جو تصور ہے وہ حقیقت سے کہیں بعید ہے 105

جنت کا وہ تصور جو قرآنِ حکیم میں بیان کیا گیا ہے

تو وہاں نشے کی بجائے کیف ہوگا' رفاقت ہوگی 106

جنت کی بنیادی خصوصیات کا ذکر اور فراوانی کا تذکرہ 107

جس معاشرے کا خدا خود میزبان ہو' اس معاشرے کا کیا کہنا! 108

اہلِ جنت کے لیے خدا تعالیٰ کی طرف سے سلامتی کی نوید ایک بہت بڑی نعمت ہوگی 108

جنتی زندگی میں تمدنی طور پر نہ تو کوئی کسی سے
دھوکا کھاتا ہے اور نہ ہی کسی کو دھوکا دیتا ہے 109

پانچواں باب: سورۃ یٰسٓ (آیات 60 تا 73)

ہمارے ہاں یومِ الست کی نوعیت 111
انسان کی فطرت اور ہدایتِ خداوندی 112
اصل بات تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ انسانوں کو
اپنی طرف سے بھیجی گئی راہنمائی کا احساس دلاتا ہے 113
دنیا میں وہی نظام قائم رہ سکتا ہے جو پوری نوعِ انسانیت
کے لیے منفعت بخش ہو 113
عقلِ انسانی کو وحی کے تابع رکھنے کا دوسرا نام صراط مستقیم ہے 114
آج پورے کرہ ارض کا ہر فرد سکونِ قلب کی نعمت سے محروم ہے 114
جرم کا اقرار انسان کے جسم کا ایک ایک انگ خود کرے گا 115
ارب ہا ارب انسانوں کے انگوٹھوں کے نشانات
کی کیفیت ایک دوسرے سے مختلف ہے 115
دنیا بھر کے طبقوں کی راہنمائی کے لیے خیر و شر کے مسئلے کا قرآنی حل 116
''خدا کے متعلق یہ تصور کہ وہ خود ہی گمراہ کرتا ہے اور خود ہی
اسے جہنم میں پہنچا دیتا ہے'' کی قرآن سے وضاحت 117
انسانی جسم تو عمر کے ساتھ ساتھ کمزور ہو ہی جاتا ہے
لیکن اس چیز کا اثر اس کی خودی یا انسانیت پر نہیں پڑتا 118
بڑھاپے میں ماں باپ سے حسن و سلوک سے پیش آنے کی ہدایت 118
قرآن حکیم کے حقائق کو واضح کرنے کے لیے
تشبیہات و استعارات کی اہمیت 120
قرآنِ حکیم کے نزدیک شاعری کی بنیاد صرف
جذبات پر ہوتی ہے، حقائق پر نہیں ہوتی 121
عربوں کے ہاں شاعری کی اہمیت اور اس کا مقام 122
انقلابی شخصیت تو ہمیشہ اپنے سامنے ایک عظیم پروگرام لیے ہوتی ہے
جو کوئی بھی زندگی کے حقائق سے آگہی حاصل کرنا چاہے 122
سورۃ یٰسٓ اس کے لیے اپنے اندر حیاتِ نو کا پیغام لیے ہوئے ہے 123
اقبالؒ کے الفاظ میں ''تصوف سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے'' 123
مرنے والے کی قبر پر قرآن پڑھنے کا نتیجہ 124
حیوانی سطح پر زندگی گزارنے کے نتیجہ میں انسان
خود حیوان بن کر رہ جاتا ہے 125
حیوانی سطح زندگی کے اندر اقدار نہ ہونے کی وجہ سے
شرفِ انسانیت باقی نہیں رہتا 126
حیوانی سطح پر زندگی گزارنے والے آنکھیں، کان اور دماغ تو رکھتے
ہیں مگر نہ وہ دیکھتے ہیں، نہ سنتے ہیں اور نہ ہی وہ سوچتے ہیں 127
حیوانی سطح پر انسان سے انسان کا واسطہ ہمیشہ
ذلت آمیز سلوک کی شکل میں ہی ظاہر ہوتا ہے 128
قومِ عاد کی تباہی کی بنیادی وجہ ان کی حیوانی سطح زندگی تھی 128
قوموں کی طرف سے قوانین کی سرکشی کا نتیجہ اختیار و ارادہ
سے محرومی کی شکل میں نکلتا ہے 129
محکوم قوموں کی حالت اس گدھے کی سی ہوتی ہے جو مالک کا
بوجھ بھی اٹھاتا ہے اور پھر اس سے ڈنڈے بھی کھاتا ہے 129
انسان کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں اپنے اختیار کا
خود مالک ہوتا ہے 130
قرآنِ حکیم میں مالک کا لفظ جہنم کے داروغے کے لیے آیا ہے 131

کسی نبی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدا کے حکم کی اطاعت
کے علاوہ انسانوں سے کہے کہ میرے بندے بن جاؤ 131
انسانیت کی برومندی کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ کے دور کا ایک واقع 132
یوم الدین یعنی اسلامی مملکت کے نظامِ حیات کے
خدوخال پر ہونے والی بحثیں 133

چھٹا باب: **سورۃ یٰسٓ** (آیات 74 تا اختتام)

15 اگست 1947ء کے دن کی اہمیت اور اس دور کے
کچھ تاریخی حقائق 135
تقسیمِ ہند کے سلسلہ میں نقشوں کی تیاری کی کچھ روئداد 137
تقسیم کے وقت راتوں رات باؤنڈری کمشن نے گورداس پور کی
نو کی نو تحصلیں پاکستان کے نقشے سے خارج کر دیں 138
کسی ملک کی آزادی اور انسانوں کی آزادی میں بنیادی فرق 140
آزادی کے بعد سے اس وقت نامساعد حالات کے
پیشِ نظر نوجوان نسل کی پریشان نظری اور اس کا حل 140
ہم نے آج تک تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ ہی رقم نہیں کی 141
''ہندو کیا ہے''؟ کے پمفلٹ کی اشاعت کا تقاضا ہے
کہ اس کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے 141
انسان حیوانوں کا مالک تو ہو سکتا ہے مگر انسانوں کا نہیں 141
خدا کا محکوم ہونا کوئی نظری بات نہیں، یہ تو اس کے
احکامات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کا نام ہے 142
محکومی کا پہلا نشان یہ ہے کہ وہاں تکریمِ آدمیت نہیں ہوتی 143
مذہبی طور پر ہندو قوم کی نفسیاتی کیفیت کا ایک عملی مظاہرہ 143
برہمنوں کی سڑک پر سے شودروں کا گزر ہی نہیں ہو سکتا
بلکہ اسے تو قتل کر دیا جاتا ہے 144
اکثریت کی بنا پر ہندوستان میں مستقل طور پر ہندوؤں
کی حکومت کا نام جمہوریت ہے 144
مفاد پرستی کی ذہنیت اور انسان کے لاؤلشکر مکافاتِ عمل
کی زنجیروں میں جکڑ لیے جاتے ہیں 145
نبی اکرم ﷺ کی حساس طبیعت کی کیفیت کے
متعلق قرآن حکیم کا ارشادِ خداوندی 145
انسانی زندگی کی تمام ثمر باری جہانِ فردا کے
متعلق مکافاتِ عمل کے ایمان پر ہے 146
انسانی زندگی ایک ایسی عمارت ہے جو حسنِ عمل کے
سہاروں کے بغیر تعمیر ہی نہیں ہو سکتی 146
اہل یورپ کے فلاسفر، عقل کی بنیاد پر، خراماں خراماں
قرآنِ حکیم کے بیان کردہ تصورات کی طرف آ رہے ہیں 147
زندگی کی مختلف منازل کے تعارف کے سلسلہ میں
قرآن حکیم کے اپنے دلائل 148
موت کے بعد زندگی کی حرات کیسے وجود میں آئے گی،
یہ کیسے ہو سکے گا؟ 149
کائنات کا یہ اس قدر محیّر العقول سلسلہ، جو بالکل
معدوم تھا، وہ کیسے وجود پذیر ہوا؟ 150
قدرت کا قانون تخلیق 150
کارخانہ قدرت کے متعلق ایمان کی پختگی کے
معاملے میں ہماری اپنی حالت 151
قدرت کی طرف سے کائنات کا ذرہ ذرہ قانون
کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے 151

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ تمنا

آج نوعِ انسانی کا جمِ غفیر معاشرتی، سیاسی اور تمدنی طور پر اپنے اپنے خود ساختہ نظریات وتصورات کے فریبِ نفس میں مکمل طور پر اسیر ہونے کے باعث باہمد گر جس قدر غسلِ خوں میں مصروفِ کار ہے اس کے پیشِ نظر اگر اس دور کو تاریخ کا بدترین دور متصور کیا جائے تو یہ بے جا نہ ہوگا۔ لہٰذا دورِ حاضر کی اِس ناگفتہ بہ اور خون آلود بدنما تصویر کے اِن بدنما داغوں کو مٹانے کی خاطر نوعِ انسانی کے لیے یہ امر اشد ضروری ہی نہیں بلکہ لازم ہے کہ رب العٰلمین نے ذکر للعالمین کی شکل میں انسانوں کی اس عالم گیر برادری کے لیے جو لاریب، بین، واضح، مکمل اور محفوظ ضابطۂ حیات عطا کیا ہے وہ اس نسخۂ کیمیا کو ایک بار پھر آزمالے۔ کیونکہ اِس نسخۂ کیمیا کا ہمیشہ سے یہ دعویٰ رہا ہے کہ اس نے انسان کی تمام نفسیاتی بیماریوں کا شافی علاج اپنے اندر محفوظ کر رکھا ہے۔ چنانچہ اسی بناء پر اس کا یہ دعویٰ بھی ہے کہ یہ وہ نسخہ کیمیا ہے کہ جو انسانی عقل کو کسی شکل میں بھی راہِ اعتدال سے نہیں ہٹنے دیتا بلکہ اس کا ایک ایک لفظ فہم وفراست اور دلیل وبرہان کے چراغ روشن کرتے ہوئے صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتا ہے اور اس طرح زندگی کے الجھے ہوئے گیسوؤں کو سنوارتا چلا جاتا ہے، اور اس گم کردہ راہی کو کبھی مایوس ہونے ہی نہیں دیتا۔ اس سراجِ منیر کا یہی وہ محکم سہارا ہے کہ جس کی بناء پر کہا گیا ہے کہ

رات کے ماتھے پہ افسردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشیدِ درخشاں کے نکلنے تک ہے

برادرانِ عزیز! بزمِ طلوعِ اسلام لاہور کا یہی وہ جذبِ دروں تھا کہ جس کی بناء پر اُس نے اس فکرِ قرآنی کو عام کرنے کی غرض سے محترم پرویز صاحب علیہ الرحمۃ کے آڈیو ویڈیو پر دیے گئے سات سو کے قریب دروسِ قرآن کو سی ڈیز سے قرطاس پر منتقل کرنے کے بعد اُنہیں کتابی شکل میں پیش کرنے کا پروگرام تشکیل دیا۔ جس کے تحت ربِ کریم کی مہربانی سے زیرِ نظر سورۃ فاتحہ کے علاوہ مذکورہ دروس میں سے اس وقت تک سورۃ نحل، سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ کہف ومریم، سورۃ طٰہٰ، سورۃ حج، سورۃ انبیاء، پارہ 29 واں اور پارہ 30 واں مکمل شکل میں قارئین کی خدمت میں پیش کیا جا چکا ہے۔ جبکہ اس طویل سفر کو مکمل کرنے کی غرض سے بزمِ لاہور آج بھی پوری طرح سرگرمِ عمل ہے اور خیال ہے کہ سورۃ فاتحہ سے والناس تک کا یہ طویل سفر تقریباً چالیس جلدوں میں مکمل ہو سکے گا۔

سورۃ فاتحہ چونکہ قرآنِ حکیم کا دیباچہ ہے شاید اس کی بنیاد پر ہی علامہ اقبال نے کہا تھا کہ انسان کی موجودہ زندگی آنے والی زندگی کا دیباچہ ہے۔

اس سورۃ میں رب العزت نے اپنی بنیادی صفات ربوبیت عالمینؒ رحمانیتؒ رحیمیتؒ اور مالکیت کو کچھ اس طرح ترتیب اور جامعیت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جس سے انسان حدودِ بشریت کے اندر رہتے ہوئے اس کے کائناتی کنٹرول کی ہیئت اور اس کی افادیت کے سمندر سے کچھ قطروں ہی سے اپنی تشنگی بجھا سکتا ہے۔ جبکہ وقت کے ساتھ ساتھ مختلف اشیائے کائنات کی نشوونما کے پوشیدہ راز بتدریج اُس کے سامنے کھلتے چلے جائیں گے۔ البتہ جہاں تک حیاتِ انسانی کا تعلق ہے تو اس کے متعلق خالقِ کائنات نے حضرت انسان کو اس کی موجودہ زندگی کے مقصدِ عظیم سے بڑی وضاحت اور بلیغ انداز میں آگاہ کر دیا ہے۔ بقول شاعر

تیری جلوہ گاہِ جمال میں میرا ذوقِ دید نکھر گیا
تیری ضوفشانیٔ حسن نے میری حیرتوں کو سجا دیا

سورۃ فاتحہ کی یہی وہ بنیادی خصوصیت ہے کہ جس کے پیشِ نظر محترم پرویز صاحبؒ نے اس کے ایک ایک لفظ کی تشریح کے لیے ایک ایک درس مختص کیا جس کی افادیت کا اندازہ قارئین کو ان دروس کے مطالعہ سے ہی ہو سکے گا۔

برادرانِ عزیز! اس موقع پر یہ چیز بغیر کسی تامل کے علی وجہ البصیرت کہی جا سکتی ہے کہ محترم پرویز صاحبؒ کی طرف سے قرآنِ حکیم کی یہ تفسیر جو قرآنِ حکیم ہی کے آئینے میں پیش کی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے اور ہمیں یقینِ محکم ہے کہ موصوف کی عمر بھر کی دیدہ ریزی اور جگر کاری کا یہ سرمایۂ حیات نوجوان نسل کے علاوہ ہر صاحبِ علم وفکر کے لیے ایک انمول خزینہ ثابت ہوگا اور اس کے مطالعہ کے بعد آخر کار انسان بے ساختہ پکار اٹھے گا کہ قندیلِ آسمانی کا یہ نسخۂ کیمیا اس قدر واضح' لاریب' آسان اور ہر قسم کے تضادات سے پاک اپنے اندر ایک ایسا ملکہ لیے ہوئے ہے کہ جو دوٹوک الفاظ میں آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن اور مستقل طور پر نوعِ انسانی کے لیے تا حیات راہنمائی کا بنا رہے گا۔

ہر قدم پر بھٹکتی رہی زندگی
ہر قدم پر وہ آواز دیتے رہے

یہی وہ حقیقتِ ثابتہ ہے کہ جس کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ''کہ اے نوعِ انسانی! تم اس ضابطہ حیات کے بلا مزد و معاوضہ مل جانے پر خوشیاں مناؤ کیونکہ یہ وہ ضابطہ حیات ہے کہ جو کچھ انسان اکٹھا کرتا ہے یہ اُس سے کہیں زیادہ قیمتی متاع ہے''۔

خدا کرے اس کرۂ ارض پر بکھری ہوئی ملتِ اسلامیہ جو اس وقت افسردہ و پژمردہ حالت میں سرگرداں ہے وہ ایک بار پھر امتِ واحدہ کے پرنور نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے قابل ہو جائے۔ عزیزانِ من! آبِ حیات کی یہی وہ شرابِ طہور ہے کہ جس کے ساغر سے مانوس ہو کر انسان اُس حسن و جمال کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لے گا جسے انسانی آنکھ کے لیے قدرت نے اپنے ہاں مستور کر رکھا ہے۔ اور پھر واقعاتی طور پر یہ باور کر لے گا کہ قرآنِ حکیم کا یہ قول یقینی طور پر حتمی ہے کہ تنہا عقلِ انسانی امامت کی سزاوار نہیں

ہوسکتی ۔ یہی وہ حتمی اعتراف ہے کہ جس کی بناء پر یہ عالمگیر برادری مصائب و آلام کی موجودہ چیخ و پکار سے آزادی حاصل کرتے ہوئے فکرِ قرآنی کے مضراب سے نکلنے والی دھیمی دھیمی اور دلوں کو موہ لینے والے اُن مسحور کن نغموں کی پر کیف آوازوں سے لطف اندوز ہو سکے گی ۔ عزیزانِ من! انسانی زندگی کا یہی وہ حسین منظر ہے کہ جس کو دیکھنے کے لیے آسمانِ عالم اس انتظار میں ہے کہ یہ بھٹکا ہوا راہی اس قندیلِ رحمانی کی روشنی میں اپنا سفرِ زندگی کب شروع کرتا ہے۔

عزیزانِ من! انسانی زندگی کے سلسلہ میں خواہ یہاں کی زندگی کے لمحات ہوں یا جہانِ فردا کا دورِ حیات' ربِ کریم تو ہر دور میں انسان کے لیے رب بھی ہے' الرحمٰن بھی' الرحیم بھی' اور مالک یوم الدین بھی۔ لہٰذا اس بناء پر خالقِ کائنات' کائنات کا مالک ہونے کے ناطے اس میں ہر آن اضافہ کرتا رہتا ہے۔ یہ وہ صفاتِ ربِ کریم ہیں کہ جن کی ترجمانی کرتے ہوئے غالب نے کہا تھا:

آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیشِ نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

برادرانِ عزیز! آخر پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ

کبھی اے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

محمد اشرف ظفر
نمائندہ بزمِ طلوعِ اسلام لاہور
جنوری 2007

پہلا باب: سورۃ یٰسٓ (آیات 1 تا 10)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1980ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآن کریم کا آغاز 36 ویں سورۃ یٰسٓ سے ہو رہا ہے۔

سورۃ یٰسٓ جیسے حیات آفرین پیغام کے متعلق ہمارا مرگ آفرینِ تصور

جیسا کہ میں نے سابقہ درس کے آخر میں عرض کیا تھا کہ یہ سورۃ خاص طور پہ بڑا ہی حیات آور پیغام لائی تھی لیکن ستم ظریفی کہیے یا ہماری بدنصیبی کہ ہم نے اسے مرگ آفریں قرار دے رکھا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ مرتے وقت، جب کسی کی جان نہ نکلتی ہو، تو کہتے ہیں کہ اسے سورۃ یٰسٓ سنایئے اور میں نے اقبالؒ (1877-1938) کا مصرع دہرایا تھا کہ از ''یٰسین'' او آساں بمیری۔ بعض دوستوں نے کہا کہ وہ پورا قطعہ کیا ہے؟ وہ ہے:

بہ بندِ صوفی و ملّا اسیری
حیات از حکمتِ قرآن نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از ''یٰسین'' او آساں بمیری

(اقبالؒ: ارمغانِ حجاز)

جہاں سے تم نے حیاتِ تازہ کا پیغام لینا تھا وہ قرآن اب تمہارے اس کام آ رہا ہے کہ جب جان نہ نکلتی ہو تو کہتے ہیں کہ اسے یٰسٓ سناؤ تا کہ جلدی نکل جائے۔ یہ جان نکالنے والی بات نہیں ہے۔ اگر کسی میں کوئی رمق، کوئی سانس بھی باقی ہیں، خواہ یہ زندگی طبعی زندگی ہی کیوں نہ ہو، سانس کی آمد و شد کی زندگی ہی کیوں نہ ہو، اس کی اس زندگی کو بھی جلدی ختم کرنے کے لیے اب اس یٰسٓ سے یہ کام لیا جاتا ہے۔ یہ وہی سورۃ یٰسٓ ہے جو مردہ انسانوں کی بستی میں صورِ اسرافیل پھونکنے کے لیے آئی تھی۔ میں دو ہی آیتوں کے بعد آؤنگا کہ وہ پیغامِ حیات آور کیا ہے جو قرآن کے اندر تو ہر مقام پہ پھیلا ہوا ہے، سارا قرآن ہی انسانیت کے لیے حیاتِ تازہ کی نوید ہے لیکن بعض سورتیں یا بعض آیتیں ہیں جن میں اُس پیغام کو Concentrated Form میں، مرتکز کر کے، دیدیا گیا ہے تو وہ چیز سامنے آجائے گی۔

یٰسین اور حروفِ مقطعات

سب سے پہلے یٰسٓ (36:1) ہے۔ اس سے پیشتر بھی جب بھی ایسے مقام آئے ہیں تو میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کی بعض سورتوں کے شروع میں یہ کچھ اس قسم کے الفاظ نہیں بلکہ حروف (Letters) ہوتے ہیں۔ وہ ایک جگہ رکھ دیئے جاتے ہیں تو ان کی شکل ایک لفظ کی سی بن جاتی ہے لیکن وہ Letters (حروف) کا مجموعہ ہوتے ہیں۔ اصطلاح میں ان کو مقطعات کہتے ہیں یعنی الفاظ سے قطع کیے ہوئے، الگ کیے ہوئے حروف اور ان کو ایک جگہ اکٹھا کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ انگریزی زبان میں آپ اسے آسانی سے سمجھ لیں گے۔ یہ انگریزی کی Abbreviations (مخففات) ہوتی ہیں مثلاً ہمارے ہاں RSVP ہے۔ یہ اس قسم کی چیزیں ہیں۔ وہ RSVP کیا ہے؟ یہ الفاظ کے حروف کو لے کر ایک جگہ رکھ دیا ہے، اس کے معنی کے لیے ان الفاظ کو دیکھنا ہوگا جن کے حروف کو ان سے الگ کر کے ایک جگہ رکھ لیا ہے [1] اسی لیے اس کو مقطعات کہتے ہیں۔ یہ سامی النسل اقوام کی زبان کا ایک اندازِ نگارش تھا، یہ وہاں عام بات تھی، وہ ایسے کرتے تھے یعنی یہ عربی ہی نہیں بلکہ سامی النسل اور عبرانی زبانیں، بھی اس کے اندر آجاتی ہیں۔ ان میں یہ انداز تھا اور عربوں کے ہاں تو پھر شاعری میں خاص طور پہ یہ انداز تھا اور وہ انداز چونکہ عام تھا اس لیے وہ لوگ بھی سمجھتے تھے جو مخاطب تھے کہ اس نے ان حروف سے کیا کہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم کی سورتوں کے شروع میں یہ حروف آئے ہیں اور روایات میں بہت سی آیتوں کے متعلق یہ آتا ہے کہ صحابہ کرامؓ نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ اس آیت کا یا آیت میں فلاں اصطلاح کا یا فلاں لفظ کا مفہوم کیا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ کہیں بھی دیکھنے میں یہ نہیں ملتا کہ کسی نے پوچھا ہو کہ ان

---

[1] RSVP= Repondez s'il Vous Plait (English please reply)

مقطعات کے معنی کیا ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ انہیں اس طرح سمجھتے تھے کہ انہیں پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں پیش آئی کہ ان کا مفہوم کیا ہے۔ چونکہ بعد میں ہمارے سامنے وہ اسلوبِ تحریر یا اسلوب نگارش نہیں رہا اس لیے پھر ہم نے ان کو خود معنی پہنانے شروع کر دیئے۔ میں نے اپنے طور پہ جو اپنے مفہوم القرآن میں انداز اختیار کیا ہے وہ یہ ہے کہ میں سمجھتا تھا یا سمجھتا ہوں کہ بجز ان چند ایک مقامات کے جہاں خاص خاص طور پہ نبی اکرم ﷺ کو یا خاص طور پہ کسی کو مخاطب کیا گیا ہو' یہ حروف اللہ کی صفات کے الفاظ کے حروف ہیں۔ مختلف صفاتِ خداوندی کو یکجا بیان کرنا ہو تو بجائے اس کے کہ خدا کو علیم وحکیم کہا جائے الم (ال م) کہہ دیا جائے۔ اللہ علیم وحکیم کا ارشاد ہے کہ **ذٰلِکَ الۡکِتٰبُ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ**(2:2)۔ میں نے بہرحال اپنے طور پہ یہ لیا ہے اور اس کا انداز یہی ہے کہ ان حروف سے آپ جو مناسب الفاظ ہیں وہ خود دیکھ لیں کہ ان سے کیا بنتا ہے اس لیے اس طرح سے مقطعات کے جو معنی ہیں وہ متعین کیے جاتے ہیں۔ لیکن یہ جو یٰسٓ ہے ''یہ س'' تو ہے اس کے اندر جسے آپ کہیں گے مخفف لیکن اس میں جو ''یٰ'' کہا گیا ہے تو یہ نبی اکرم ﷺ کو مخاطب کیا گیا ہے' انہیں یہاں کیا گیا ہے' پکارا گیا ہے' اس لیے کہ اگلی آیت کے بعد ہے کہ **اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ** (36:3) تو خدا کے بھیجے ہوئے مرسلین میں سے ہے۔ جب وہاں یہ تُو خود آ گیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ یہاں جو ''یٰ'' کا خطاب ہے یہ نبی اکرم ﷺ سے ہے۔

یٰسین یعنی تباہ حال انسانیت کو سہارا دینے والی عظیم شخصیت

یہاں بات ''س'' کی ہے' وہ میں ابھی عرض کرتا ہوں لیکن یہاں مخاطب نبی اکرم ﷺ ہیں کیونکہ کہا گیا ہے **یٰسٓ. وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ. اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ**(36:1,3) بات سمجھ میں آ گئی کہ اے ''س!'' تو تو مرسلین میں سے ہے' تو حضور ﷺ مخاطب ہیں۔ ''س'' عجیب چیز ہے۔ اب تو ہمارے ہاں یہ چھتیں سیمنٹ کی پڑتی ہیں' اس سے پہلے ان میں وہ جو گارڈر دیا کرتے تھے' اب سلیب بھی نہیں ہوتا' بڑی بڑی لمبی چھتیں' وہ سیمنٹ اور لوہے سے ڈال دیتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے جو چھتوں کا انداز تھا وہ یہ تھا کہ وہ اس میں لکڑی کی شہتیریاں ڈالتے تھے' تو بعض اوقات وہ لکڑی کی شہتیریاں کمزور ہو جاتی تھیں تو ان کے نیچے ایک سہارا دینے کے لیے بڑی مضبوط لکڑی لگا دی جاتی تھی تاکہ وہ کمزور لکڑیاں گر نہ پڑیں۔ سامی زبان میں یہ جو لکڑی لگا دی جاتی تھی اس کو ''س'' کہتے تھے۔ کہا ہے کہ یٰسٓ (36:1) اے وہ جو کمزوروں کو سہارا دینے کے لیے دنیا میں آیا ہے! کیا کیا صفاتِ نبوی ﷺ آئی ہیں **یاایھا النبی یاایھا الرسول** تو آتا ہی ہے' وہ تو رسول کا منصب تھا لیکن جہاں کہیں **یاایھا المزمل** کہا ہے **یاایھا المدثر** کہا ہے تو وہ حضور ﷺ کی وہ خصوصیات یا جو مقاصدِ نبوت و رسالت تھے' وہ وہاں بیان کیے گئے ہیں: اے کارواں سالار! (مزمل)' اے مدثر!

یعنی دنیا کے جہانِ خزاں دیدہ پہ نئی بہار لانے کا موجب بننے والے! یہ ہیں یہاں۔ وہاں ''یٰ'' کہہ کر پکارا گیا ہے یعنی جو بنیادی خصوصیت حضور ﷺ کی تھی اُس کی طرف اشارہ کر کے کہا گیا ہے کہ یٰسٓ (36:1)۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ پھر یہ یٰسٓ کیا ہے' کیا ہے منصبِ نبوت' کیا تھا فریضۂ رسالت' جسے نمایاں کر کے یہ کہا گیا ہے اور پھر عربوں کی زبان ہے چونکہ یہ کمزوروں کو سہارا دینے والی لکڑی تھی اس لیے ان کے ہاں قوم کے سردار کو بھی ''س'' کہتے تھے۔ تو وہاں قوم کا سردار غریبوں اور مظلوموں کا خون چوسنے کے لیے نہیں آتا تھا۔

لفظ انسان کے بنیادی معنیٰ ''دوسروں کو سہارا دینے والا''

عربوں کے ہاں دیکھیے خصوصیت کیا ہے؟ وہ سردار کو کیوں یہ کہتے تھے؟ اس لیے کہ وہ سردار' ان کے ہاں کمزوروں' غریبوں' ناتوانوں' ضعیفوں کے سہارے کا موجب بنتا تھا اس لیے یہاں سے انہوں نے یہ لفظ لیا اور سردار کے معنی میں بھی استعمال کیا۔ اور آگے اس زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے انسان کے لیے بھی اس لفظ کو استعمال کیا۔ کہا کہ انسان تو ہم کہتے ہی اسے ہیں جو غریبوں اور ضعیفوں کے سہارے کا کام دے' دوسرا تو انسان ہوتا ہی نہیں ہے۔ تو ان کی زبان میں ان تینوں مواقع کے اوپر وہ ''س'' کا استعمال کرتے تھے۔ بنیادی چیز تو یہ تھی کمزور لکڑیوں کو سہارا دینے والا کہ گر نہ پڑیں' قوم کا سردار کہ کمزوروں اور ضعیفوں کے سہارے کا موجب بنے اور عربوں کی خصوصیت یہ کہ وہ انسان کہتے ہی اُسے تھے جو کمزوروں کا سہارا بنے' دوسرے کو وہ انسان ہی نہیں سمجھتے تھے۔ اب غور کیجیے کہ اُس زبان میں سے قرآنِ کریم نے حضور ﷺ کے لیے یہ جو ''س'' کا انتخاب کیا ہے کتنے معانی اس کے اندر پوشیدہ ہیں۔ عزیزانِ من! دریا کوزے کے اندر بند ہو گیا ہے۔ امت کے سردار کی حیثیت سے نہیں' میں تو یہی کہونگا کہ اے وہ جو نوعِ انسانی کے ضعیفوں اور ناتوانوں کا سہارا بننے کے لیے آیا ہے' وہ ہے یٰسٓ۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے نبی اکرمؐ کے رسول ہونے کی شہادت خود قرآن حکیم کی تعلیم ہے

اب اس کی شہادت کیا ہے؟ کہا ہے کہ اِنَّکَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ (36:3) تُو خدا کے بھیجے ہوئے قاصدوں میں سے ہے۔ رسول قاصد کو کہتے ہیں' پیغامبر کو کہتے ہیں۔ خدا کے پیغامات کو انسانوں تک پہنچانے کے لیے آیا ہے اس کا ثبوت کیا ہے کہ تو خدا کی طرف سے آیا ہے؟ دیکھیے! چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کے اندر قرآن کتنے حقائق بیان کر جاتا ہے! ثبوت اس کا کیا ہے؟ کہا ہے کہ وَالْقُرْاٰنِ الْحَکِیْمِ (36:2) ''و'' کے معنی شہادت کے ہوتے ہیں' ہمارے ہاں تو قسم کے معنی لے لیا جاتا ہے یعنی میں کیا کیا عرض کروں! جہاں بھی آپ دیکھیں گے: وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ . وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ (95:1.2) قسم ہے زیتون کی'

قسم ہے انجیر کی ''انجیر تے زیتون دیاں سونہاں کھا کے اللہ دسن ڈیا ہیگا اے ❶''۔ یہ عربی زبان کے اندر عظیم چیزیں ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ پہلا جو کہیں گرا ہے ایک شخص' اس کے بعد میلے میں آنے والے سارے گرتے چلے گئے۔ کسی نے یہ بات کہدی ورنہ اُسی عربی زبان میں' عزیزانِ من! یہ چیزیں موجود ہیں۔ مجھ پہ کوئی الہام اور وحی تو نہیں ہو رہی' وہیں انہی کتابوں سے میں نے اپنا ''لغات القرآن'' مرتب کیا ہے۔ وہ شہادت کے لیئے' گواہی کے لیے اس چیز کو پیش کرتے تھے۔ یہ بات' یہ تیرا دعویٰ کہ تُو یا یہ جو ہم کہتے ہیں کہ تُو خدا کے بھیجے ہوئے قاصدوں میں سے' یہ جو پیغامِ خداوندی لوگوں تک پہنچاتے ہیں' اس کا ثبوت کیا ہے کہ تُو خدا کا پیغام پہنچا رہا ہے' اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہہ رہا' کیا ثبوت ہے اس کا' کیا گواہی ہے اس کی' کیا شہادت ہے؟ کہا کہ **وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ(36:2)** قرآن خود اس کی شہادت دیتا ہے کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہے' یہ خدا کا کلام ہے اور تو اسے پہنچانے والا ہے۔

اس کرّہ ارض پر قرآنِ حکیم سے بڑا کوئی معجزہ نہیں

نبوتِ نبی اکرم ﷺ کے متعلق کتابوں کی کتابیں لکھی چلی جا رہی ہیں کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ حضور ﷺ پر خدا کی وحی نازل ہوتی تھی اور حضور ﷺ خدا کا پیغام پہنچاتے تھے' اُنہوں نے اپنی طرف سے (معاذ اللہ) قرآن نہیں بنا دیا تھا۔ اس کا ثبوت کیا ہے؟ اور پھر اس عجوبہ پسند قوم کو ثبوت کے لیے کیا چاہیے؟ یہ کہ اپنے بالوں میں سے دودھ نچوڑ کر یہ بتایا جائے وہ کسی کی قیادت ہی نہیں مانتے' سینکڑوں معجزات کے درپے ہیں۔ اور قرآن بار بار یہ کہہ رہا ہے کہ یہ تم سے معجزے مانگتے ہیں' ان سے کہو کہ بابا! معجزہ اس قرآن کے سوا اور کیا ہے! تم نہیں مانتے تو اس کی مثل لا کر بتاؤ تو بات صاف ہو جائے گی اور سب سے بڑا معجزہ یہی ہونا چاہیے جو قیامت تک ہے۔ اگر حضور ﷺ نے وہ معجزے ان کو دکھائے بھی ہونگے تو بات تو وہیں ختم ہوگئی' ہم کیسے مان لیں' آج کے غیر مسلم سے یہ بات کیسے منوائیں کہ یہ حضور ﷺ کا اپنا انسان کے ذہن کا تراشیدہ' اس کی فکر کا وضع کردہ نہیں ہے' یہ ماورائے فکرِ انسانی کوئی سرچشمہ علم ہے' جہاں سے یہ آیا ہے۔ یہ ہم کیسے منوائیں؟ کیا یہ کہہ کر منوائیں کہ صاحب! چودہ سو سال پہلے حضور ﷺ ایک درخت کے پاس گئے تھے تو اُس نے آپ ﷺ کی نبوت کی شہادت دی تھی؟ وہ کہے گا کہ ٹھیک ہے' وہاں دی ہوگی' مجھے بتاؤ میں پوچھتا ہوں کہ اس کی کیا شہادت ہے' اس کی کیا گواہی ہے' اس کا کیا ثبوت ہے کہ یہ حضور ﷺ کی اپنی فکر نہیں تھی؟ قرآن نے کہا کہ **مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى (53:3)** وہ اپنے خیالات نہیں پیش کر رہا تھا۔ اس کا کیا ثبوت ہے؟ کہا کہ **وَالْقُرْاٰنِ الْحَكِيْمِ(36:2)** یہ قرآن خود اس کا ثبوت ہے کہ یہ اس کے اپنے ذہن کی چیز نہیں ہے۔ اور یہ قیامت تک کے لیے چیلنج ہے کہ اگر تم نہیں مانتے **وَ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ**

---

❶ انجیر اور زیتون کی قسمیں کھا کر اللہ ہمیں بتا رہا ہے۔

رَیۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰی عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ (2:23) اگر تمہارے دل میں اس کا شک اور شبہ ہے کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہے' اپنی طرف سے پیش کرتا ہے' تو لاؤ اس کی مثل ایک سورۃ بنا کر لاؤ۔ یہ چیلنج اُس زمانے کے عربوں کو ہی نہیں تھا' چودہ سو سال سے چلا آ رہا ہے۔ آج بھی یہ چیلنج اسی طرح سے مشہور ہے' ساری دنیا کے جتنے بڑے بڑے عربی کے ادیب بھی موجود ہیں' اور اب تو عربوں سے زیادہ یہ غیر عرب جو ہیں' یورپ کے ادیب جو ہیں' وہ عربی زبان میں ان سے بھی آگے نکل گئے ہیں' یہ ان سب کو چیلنج ہے کہ فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَۃٍ مِّنۡ مِّثۡلِہٖ (2:23) اس کی مثل ایک سورۃ بنا کر لاؤ۔ خدا کی طرف سے یہ کتنی زبردست چیز ہے کہ اے وہ انسان! جس کی طرف یہ وحی کی جاتی ہے یعنی اے ہمارے رسول! یہ لوگ تم سے تمہارے اس دعوے کا ثبوت مانگتے ہیں کہ تم خدا کی طرف سے رسول ہو۔ ان سے کہو کہ خود میرا یہ پیغام یعنی قرآن حکیم اس پر شاہد ہے کہ میں خدا کے رسولوں میں سے ہوں۔ میرے دعوے کی صداقت کا ثبوت خود یہ قرآن ہے۔ اس پر غور و فکر کرو تو تم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی۔ پھر سنو! یٰسٓ- وَ الۡقُرۡاٰنِ الۡحَکِیۡمِ- اِنَّکَ لَمِنَ الۡمُرۡسَلِیۡنَ (36:1.2.3) حقیقت ہے کہ تُو خدا کا بھیجا ہوا قاصد ہے اور یہ قرآن جسے تو دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہے اس حقیقت پر شاہد ہے۔ اور اسی سے یہ نظر آتا ہے کہ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (36:4)۔ میں اس صحیح راستے' توازن بدوش راستے پر چل رہا ہوں جو کاروانِ انسانیت کو اس کی منزلِ مقصود تک پہنچا دیتا ہے۔

قرآن حکیم تیئیس سال میں نازل ہونے والی وہ کتاب ہے جس کا ایک ایک حرف حکمت پر مبنی ہے

عزیزانِ من! وہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا قاصد ہے' وہ چٹھی رسان چٹھی دے جاتا ہے اور اس کے بعد چلا جاتا ہے' اس کی ذات سے اس چٹھی کو کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ آپ نے کبھی نہیں پوچھا ہوگا کہ یہ پوسٹ مین کس قسم کا ہے' کیسا ہے' وہ تو چٹھی دے گیا' چلا گیا۔ اگلی بات اب رسول اللہ ﷺ کی ذات آ گئی' وہ محض چٹھی رسان نہیں ہے' وہ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ (36:4) ہے۔ وہ راستہ جو قرآن بتاتا ہے تو وہ اس کے اوپر خود چل بھی رہا ہے۔ یہ محض قاصد ہونا ہی نہیں ہے' خود اس راستے پہ چلنا ہے۔ اور یہ سارا کچھ کیا چیزیں ہیں؟ یہ کہ خود قرآن نبی اکرم ﷺ کی سیرت کا بتا رہا ہے کہ صاحبِ قرآن خود صراطِ مستقیم کے اوپر ہے۔ کہا کہ تَنۡزِیۡلَ الۡعَزِیۡزِ الرَّحِیۡمِ (36:5) یہ چیزیں مل کر اس کی شہادت دیتی ہیں کہ یہ خدائے رحیم کی طرف سے بتدریج نازل ہوا ہے۔ نہ تیرا خود ساختہ ہے' نہ کسی اور انسان کا وضع کردہ ہے۔ یہ عربی زبان جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ جو تنزیل کا اور رحیم کا باب آتا ہے یہ تدریجاً جو کوئی کام ہو رہا ہو' اس کے لیے آتا ہے۔ قرآن تیئیس سال کے عرصے میں نازل ہوا' اس لیے تنزیل ہے' قرآن کی تنزیل اس لیے ہے کہ یہ بتدریج' آہستہ آہستہ' تکمیل تک پہنچا ہے۔

قرآنِ حکیم اپنے ہاں سزا کی بجائے جزا کا تصور پیش کرتا' جسے کسی عمل کا فطری نتیجہ کہا جاتا ہے

کہا یہ ہے یہ ساری چیزیں اس کی شہادت دیتی ہیں کہ'' یہ قرآن خدا کی طرف سے بتدریج آ رہا ہے''۔ اب سوال یہ تھا کہ یہ کاہے کے لیے آ رہا ہے' کیوں دیا' تمہیں کیوں بھیجا گیا' یہ سب کچھ کاہے کے لیے کیا گیا؟ کہا کہ **لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (36:6)** یہ قرآن تیری طرف اس لیے نازل کیا گیا ہے کہ تو ابتداءً اس قوم کو' اس کے غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کردے جن کے آباؤ اجداد کی طرف کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا اس لیے انہیں معلوم نہیں کہ صحیح روشِ زندگی کونسی ہے۔ عزیزانِ من! قرآنِ کریم' خواہ وہ قوموں کی تباہی ہو' افراد کی غفلت شعاری ہو' اُن کے اعمال کے نتائج کا بتاتا ہے۔ یہ خدا کی وحی ہے۔ قرآن کے بتائے ہوئے قانونِ مکافاتِ عمل کے مطابق ان کے اعمال کا مواخذہ کرنا ہوتا ہے۔ یہ جسے آپ کسی کی گرفت کہتے ہیں' مواخذہ کہتے ہیں' عام الفاظ میں سزا کہتے ہیں' تو اسے ذہن نشین کر لیجیے کہ قرآن میں تو سزا کا لفظ بھی نہیں ہے۔ یہ سزا نہیں' یہ جزا ہوتی ہے' یہ تمام چیزیں کسی کے عمل کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں۔ اس کے لیے قرآن کہتا ہے کہ دو شرطیں لازم ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ اُس قوم تک خدا کا پیغام پہنچ گیا ہو' اگر کسی تک یہ پیغام پہنچا ہی نہیں ہے تو اس پہ تو مواخذہ نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس قوم کی ذہنی سطح اتنی اونچی ہو کہ وہ سماعت' بصارت اور قلب سے کام لینا جانتی ہو' اُس میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہو اور اس تک پیغام پہنچ چکا ہو۔ جب یہ ہو جائے تو پھر اتمامِ حجت ہو جاتا ہے کہ پیغام تم تک پہنچ گیا تھا۔ پوچھا کہ کیا وہ پیغام تم تک پہنچ چکا تھا؟ کہا کہ جی! پہنچ گیا تھا۔ کیا سمجھ لیا تھا؟ جی ہاں! سمجھ بھی لیا تھا۔ کیا اُس کے باوجود اُس کے خلاف چلے؟ جی! تو سزا کے مستحق ہو؟ اس پر تو نہ کر ہی نہیں سکتا۔ اور اس کے برعکس اگر یہ ہو کہ صاحب! ہمیں تو پتہ ہی نہیں ہے' ہم تک تو پہنچا ہی نہیں ہے' کسی نے بتایا ہی نہیں ہے۔ ٹھیک ہے عدل کا تقاضا یہی ہے کہ اس پہ گرفت نہ ہو اور اگر وہ پیغام پہنچا ہے مگر وہ ذہنی سطح ہی ایسی نہیں رکھتا کہ اُس کو سمجھ بھی سکے تو وہ بھی قابلِ مواخذہ نہیں ہوتا۔ یہ موضوع ایسا ہے کہ پہلے بھی کئی دفعہ آیا ہے' آگے کہیں یہ آئے گا تو میں پھر اُس وقت قرآن کی ساری تفصیل بتاؤنگا اور پھر یہ جو اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ صاحب! جن تک یہ پہنچا ہی نہیں یا جن کی ذہنی سطح اتنی تھی ہی نہیں' پھر ان سے مواخذہ کیسا' ان کو سزا کیسی' تو میں وہاں عرض کرونگا کہ نہ یہ مواخذہ ہے' نہ یہ حقیقت میں سزا ہے۔ لیکن یہاں ضمناً یہ بات نہیں آسکتی۔

انسانی زندگی میں آگہی کی اہمیت

کہا یہ گیا کہ **لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ فَهُمْ غٰفِلُوْنَ (36:6)** تا کہ یہ قوم جس کی طرف اس سے پہلے کوئی نبی نہیں آیا اور وہ بے خبر ہیں کہ خدا کی طرف جانے والا صحیح راستہ کیا ہے' تو اُنہیں اس کی وارننگ دیدے کہ غلط راستے پہ چلنے کے تباہ کن نتائج

ہونگے جس پہ تم چلے جارہے ہو۔تو گویا وہ چیز جو میں نے کہی تھی کہ اتمامِ حجت ضروری ہے کہ اس قوم تک یہ پیغام پہنچے۔ یہاں یہ کہا کہ وہ قوم جس کی طرف اس سے پہلے کوئی آگاہ کرنے والا یعنی کوئی نذیر نہیں آیا تُو اُس قوم کو آگاہ کردے۔عربوں کی تاریخ بھی بتاتی ہے کہ حضرتِ اسماعیل علیہ السلام جن کے ہاتھوں اپنے باپ کی مشاورت سے کعبہ کی تعمیر ہوئی تھی کے بعد اس قوم میں کوئی نبی نہیں آیا تھا۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے جو بھائی حضرت اسحاقؑ تھے' جن سے یہ بنی اسرائیل کا سلسلہ چلا ہے تو بنی اسرائیل میں تو تسلسل تھا' انبیائے کرامؑ چلے آرہے تھے لیکن بنی اسماعیلؑ میں حضرت اسماعیلؑ کے بعد کوئی نبی عربوں کی طرف نہیں آیا۔ نبی اکرم ﷺ اس کے بعد پہلے نبی تھے' شارحِ اسماعیلؑ کے آخری نبی: پہلے حضرتِ اسماعیلؑ اور آخر میں نبی اکرم ﷺ۔تو درمیان میں کوئی نبی نہیں آیا۔اس لیے کہا کہ اس قوم کی طرف تمہیں بھیجا گیا ہے جن کی طرف اس سے پیشتر' ان کے آباؤ اجداد کی طرف اس سے پیشتر' کوئی نبی نہیں آیا تھا تا کہ انہیں یہ حجت نہ رہے کہ ہم تو بے خبر تھے ہمیں پتہ ہی نہیں تھا کہ صحیح راستہ کیا ہے تو اس لیے تمہیں اس قوم کی طرف بھیجا جارہا ہے۔ کہا ہے کہ **لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ(36:7)**۔ یہ اتمامِ حجت ہوگیا کہ ان کی طرف یہ پہنچا بھی دیا۔

زبان کے لحاظ سے عرب اقوام کی ذہنی سطح

ان عربوں کی ذہنی سطح تو اتنی اونچی ہے کہ قرآن جیسے حقائق کو دنیا میں بھیجنے کے لیے ان کی زبان کو منتخب کیا گیا تو اب اس قوم کی جو سطح ہے' اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ یورپ کے یہ جو لسانیات کے عالم ہیں' زبانوں کے تقابل کے جو ماہر ہیں' ان علماء نے زبانوں کے تقابل کے سائنٹفک طریقے سے یہ بتایا ہے کہ چودہ سو سال کے پہلے کا جو عرب تھا' اُس زمانے کی ساری اقوام سے صرف زبان کے اعتبار سے اُنہوں نے تقابل کے بعد بتایا ہے' کہ کوئی قوم ذہنی اعتبار سے اس سطح پہ نہیں تھی۔آپ کو یاد ہوگا اس کے لیے میں ایک کتاب کا حوالہ دیا کرتا ہوں۔اس کتاب کا نام "Cosmic Consciousness" ہے۔ یہ لوگ بڑی تحقیق کرتے ہیں۔ بہرحال ان کی ذہنی سطح بھی ایسی بلند تھی اور پیغام بھی پہنچا دیا گیا۔اب کہا کہ **لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ (36:7)** اس کے معنی ہیں کہ حجت پوری ہوئی۔اب یہاں ہے کہ **لِتُنْذِرَ قَوْمًا مَّآ اُنْذِرَ اٰبَآؤُهُمْ (36:6)** تا کہ تو اس قوم کو اس کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کردے جن کے آباؤ اجداد کی طرف کوئی آگاہ کرنے والا نہیں آیا۔ میں نے کہا تھا کہ ابھی میں عرض کرونگا کہ حقیقت میں یٰسٓ کا پیغام کیا ہے۔ یہاں تو صرف اتنا ہی کہا ہے کہ اس قوم کو صحیح اور غلط راستے سے تو آگاہ کردے لیکن اسی سورۃ میں آگے چل کر 70 ویں آیت میں کہا ہے کہ اس کو آگاہ کیا کہ موت ہے' آگے نہ بڑھنا۔موت سے کسے آگاہ کیا جاتا ہے؟ کیا کبھی کسی مردہ کو بھی موت سے آگاہ کیا ہے؟ تم لوگوں میں سے موت سے آگاہ تو زندہ کو کیا جاتا ہے کہ زندہ ہو زندہ رہنا چاہتے ہو تو اس راستے

پہ نہ چلنا' آگے راہزن کھڑا ہے' سانپ کھڑا ہے' کھڈ ہے خطرہ ہے' مر جاؤ گے' موت آجائے گی۔ زندہ ہے تو اُس سے کہو گے کہ احتیاط برتنا' وارننگ زندہ کو دی جاتی ہے۔ یہاں ایک بڑی اہم حقیقت سامنے آئی کہ قرآن کا پیغام مردہ قوم کے لیے نہیں ہے۔ اس میں کہا ہے کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) تُو اُسے ہی متنبہ کرسکتا ہے' آگاہ کرسکتا ہے' وارننگ دے سکتا ہے کہ خطرے سے بچنا' جو زندہ ہے۔ الفاظ کے اعتبار سے بات بڑی چھوٹی ہے اور دنیا بھر کے عظیم حقائق قرآن نے اس کے اندر سمو کر رکھ دیئے۔ ہماری نامرادیاں' محرومیاں' بدنصیبیاں' شکایتیں' شکوے گلے' اور افسردگیاں سب اس لیے ہیں کہ ہم تو مردوں کو حیات آور پیغام سناتے ہیں اس سے مایوسی تو ہونی ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) یہ آگاہی تو صرف اس کے لیے ہے جس میں زندگی کی حرارت باقی ہے اور جو زندہ رہنا چاہتا ہے۔ ہمارا اس دور کا قرآن کو سمجھنے والا بہت کچھ کہہ گیا ہے۔ اُس نے یہ کہا ہے کہ

نگاہِ عشق دلِ زندہ کی تلاش میں ہے
شکارِ مردہ سزاوارِ شہباز نہیں

(اقبالؒ: بال جبریل)

یہ ہے لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) جو زندہ ہے اور زندہ رہنے کا متمنی ہے' چاہتا ہے کہ زندہ رہے۔

قبرستان میں دی گئی اذان کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرتی

عزیزانِ من! پردے اٹھ جاتے ہیں جب یہ مقام اور اقبالؒ کی یہ تشریح سامنے آتی ہے کہ ہم کر کیا رہے ہیں' قبرستان میں وعظ کہہ رہے ہیں اور پھر مایوس ہو جاتے ہیں' افسردہ ہو جاتے ہیں' تنگ پڑ جاتے ہیں' زچ جاتے ہیں' جسے کہتے ہیں گالیاں تک دینے لگ جاتے ہیں' سوچتے نہیں ہیں کہ یہ پیغامِ زندگی کن کو دے رہے ہیں۔ اقبالؒ (1877-1938) نے تو اپنے متعلق بھی کہا تھا کہ

بجلی ہوں' نظر کوہ و بیاباں پہ ہے میری
میرے لیے شایاں خس و خاشاک نہیں ہے

(اقبالؒ: بال جبریل)

یہ ہے لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70)۔ اور یہی چیز تھی کہ وہ عمر بھر یہ پیغام بھی دیتا رہا۔ اس کے بعد اُس نے یہ دیکھ لیا' یہ بار بار اُس نے کہا ہے کہ جو پہلی چیز ہے وہ قوم میں زندگی کی رمق کا ہونا یا زندگی کی رمق کا پیدا کرنا ہے یہ ہے کہ اس کے دل میں زندہ رہنے کی تمنا اور آرزو ہو۔ یہ پہلی چیز ہے۔ اسی لیے وہ عمر بھر یہ کچھ کرنے کے بعد یہ کہہ کر چلا گیا کہ

وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

(اقبالؒ: بال جبریل)

قوم کی بے نیازی مستغنی ہے، اس سے پرواہ ہی نہیں ہے کہ ہم زندہ ہیں یا مردہ، ٹھیک ہے یہاں جس طرح سے گزرتی ہے موج لیجیے، آخرت میں وہ بخشوانے والا بخشوا دے گا، خوامخوہ سر کھپا رہا ہے تُو بھی اور ہمیں بھی خوامخوہ کے لیے ان راستوں پہ لے آ رہا ہے۔ 'وہی میری کم نصیبی، وہی تیری بے نیازی' میری سے مراد وہ صرف اقبالؒ نہیں ہے بلکہ ہر وہ جو قوم کو زندہ کرنے کی تڑپ لے کر اٹھتا ہے، اُسے کہہ رہا ہے کہ

وہی میری کم نصیبی، وہی تیرے بے نیازی
مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمالِ نے نوازی

(اقبالؒ: بال جبریل)

یہ اس لیے ہے کہ وہی تیری بے نیازی ہے۔

اگر کسی قوم کو راہ راست پر لانا مقصود ہو تو اسے اس کے آخری سانس تک بچانے کی سوچ پیدا کرو

عزیزانِ من! زندہ رہنے کی طرف سے بے نیاز کون ہوتا ہے؟ وہی جو زندہ ہوتا ہی نہیں ہے۔ جسے زندہ رہنے کی ذرا بھی تڑپ ہوتی اس کے لیے تگ و دو ہوتی ہے۔ اس بیمار کے آخری سانس ہی کیوں نہ ہوں اس لیے تیماردار بھاگا بھاگا پھرتا ہے، ڈاکٹر کی منتیں کرتا ہے کہ خدا کے لیے ڈاکٹر صاحب! کچھ کیجیے، بے نیاز نہیں ہوتا۔ وہ مرجاتا ہے تو وہ بے نیاز ہو جاتا ہے، شیشیاں اس کے سرہانے دھری کی دھری رہ جاتی ہیں، تیماردار ایک قطرہ نہیں ٹپکاتا۔ زندگی کی طرف سے مایوس ہو جانے والا بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اس کے آخری سانس تک اسے بچانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

ہم اپنی موجودہ ذہنی پستی اور زبوں حالی کو کیونکر ختم نہیں کر سکے؟

علاج کی طرف سے قوم وہاں پہنچ چکی ہوئی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70)۔ عزیزانِ من! معلوم نہیں کہ پھر قرآن کے یہ دور آئیں یا نہیں آئیں، معلوم نہیں کہ پھر یہ موقعے بھی آئیں یا نہ آئیں، دل کی گہرائیوں سے سن لیجیے

کہیں ان چیزوں کو نوٹ بھی کر لیجیے' قرآن بڑی اہم حقیقتیں دے جاتا ہے۔ ہمارے ہاں ایک عرصہ سے یہ چرچا بھی ہو رہا ہے' کوششیں بھی ہو رہی ہیں' میں کسی کی نیت پہ حملہ نہیں کرتا' بتاتا یہ ہوں کہ ہماری بنیادی غلطی کہاں ہے؟ یہ خطۂ زمین اسلام کے نام پہ حاصل کیا گیا تھا تاکہ یہاں اسلامی معاشرہ' اسلامی نظام' اسلامی قوانین' نافذ کیے جائیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ خیال بڑا مبارک ہے' مجھے کسی کی نیت پہ شبہ نہیں ہے' میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہماری بنیادی غلطی کہاں ہے۔ نیتیں بھی نیک ہوں' بیشک عمل میں بھی خلوص ہو' یہ ٹھیک ہے تمنائیں بھی ہوں آرزو بھی ہو' اس کے باوجود کچھ نہیں ہو رہا تو کہیں غلطی ہے۔ اب بجائے اس کے کہ ہم کھڑے ہو کر یہ دیکھیں کہ وہ غلطی کہاں ہے اس کو Remove (دُور) کریں' تو پھر آگے بات چل جائے گی۔ اگر ہم اُسی پہ لگے چلے جائیں قیامت تک غلط راستہ پہ لگے چلے جایئے تو آپ' عزیزانِ من! ساری عمر چلتے جایئے' وہ صحیح منزل تک نہیں پہنچائے گا۔

اختیار کیا ہوا غلط راستہ مسافر کو کبھی منزل تک نہیں پہنچا سکتا

منزل تک پہنچنے کی آپ کی نیت بھی ہو' پاؤں میں سکت بھی ہو' چل بھی رہے ہوں' سب کچھ کر رہے ہوں' تو بھی غلط راستہ صحیح منزل پر نہیں پہنچائے گا۔ اس میں نیت کا بھی شبہ نہیں ہے' عمل کی بھی کوتاہی نہیں ہے' یہ ساری چیزیں ہیں۔ پھر غلطی کہاں ہے؟ یہ کہ راستہ غلط ہے۔ قرآنِ کریم نے پروگرام دیا ہے اور وہ ہے صحیح راستہ۔ چار لفظوں میں یہ پروگرام سامنے آجاتا ہے۔ (6:123) میں قرآنِ کریم نے استعارہ کے طور پہ کہا ہے کہ ایک قوم ہے جو مردہ ہے لیکن اس مردہ کی وہ شکل نہیں ہے جس میں زندگی پیدا نہ کی جاسکے۔ اس استعارہ کے طور پر اس قوم پہ موت طاری ہوگئی ہے جسے ہم مردہ قوم کہتے ہیں۔

مُردہ قوم کو زندگی عطا کرنے کے لیے قرآن ایک نسخۂ کیمیا ہے جس کا مقصد مُردوں کے سرہانے پڑھنا نہیں ہے' عمل کرنا ہے

پروگرام سنیے' عزیزانِ من! یہ اسلامی نظامی' اسلامی معاشرہ' اسلامی قانون' اسلامی مملکت' آپ کے سارے بنیادی مسائل حل کردے گی اُس اسلامی مملکت کا پروگرام کیا ہے' وہ کہاں سے شروع کرتا ہے؟ کہا ہے ٹھیک ہے کہ اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا (6:123) تم نے جس قوم سے ابتداء کرنی ہے وہ واقعی ٹھیک ہے کہ اُس پہ موت طاری ہوگئی ہے' مردہ قوم ہے لیکن یہ دیکھ لو کہ وہ موت ایسی تو نہیں کہ جس میں پھر وہ زندہ ہی نہ ہوسکتی ہو' خواہ قیامت میں صورِ اسرافیل بھی کیوں نہ پھونک دیا جائے۔ وہ یہ چیز کہتا ہے کہ زندہ ہوجانے کی صلاحیت قوم کے اندر موجود ہو' پہلے یہ دیکھو' پھر ایک پروگرام ہے۔ فَاَحْيَيْنٰهُ (6:123) پھر اُسے زندہ کرو۔ مردے کے سرہانے ہی یہ قرآن نہ پڑھتے چلے جاؤ۔ آپ غور کیجیے کہ قرآن کریم کہاں سے پروگرام شروع کرتا ہے۔ مردہ قوم کو لے رہا ہے لیکن

یہ پروگرام فَاَحۡیَیۡنٰہُ (6:123) ہے اُسے زندہ کرو۔ زندہ کرنے کا یہ پروگرام یہ تھا۔ کہا کہ یُعَلِّمُهُمُ الۡکِتٰبَ وَ الۡحِکۡمَةَ وَ یُزَکِّیۡهِمۡ (2:129) رسول ان کی مناسب تعلیم' مناسب تربیت کرتا ہے۔ تم بھی ان کی انسانی ذات کی صلاحیتوں کو بیدار کرو' برومند کرو' ان کو نشوونما دو۔ پہلے اس کو زندہ کرو۔ جو ویسے کی ویسی قوم ہے اُس سے یہ توقع نہ کرو کہ جو نظامِ خداوندی کے قائم کرنے کا اتنا بڑا فریضہ ہے وہ اُسی شکل میں رہتے ہوئے اسے کرلے گی۔ یہ غلط ہے قیامت تک کوشش کرو گے تو بھی کچھ نہیں بنے گی۔ اسے تو فَاَحۡیَیۡنٰہُ (6:123) زندہ کرنے کا پہلا پروگرام ہے عزیزانِ من! جب وہ زندہ ہو جائے تو پھر اگلی کڑی آتی ہے۔ وَ جَعَلۡنَا لَهٗ نُوۡرًا یَّمۡشِیۡ بِهٖ فِی النَّاسِ (6:123) پھر اس کے ہاتھ میں قرآن کی شمع دو جس سے اپنے راستے بھی روشن ہوتے چلے جائیں گے اور انسانیت کے راستے بھی وہ قوم روشن کرتی چلی جائے گی۔ یہ ہے جی نظامِ اسلامی۔ قرآن کی شمع سے اپنے راستے بھی روشن کرنا اور یَّمۡشِیۡ بِهٖ فِی النَّاسِ (6:123) اپنی ذات تک نہیں کہ میری نجات ہو جائے' باقی دنیا بھاڑ میں جائے' مجھے اس سے کچھ واسطہ نہیں! یہ تو عالمگیر انسانیت کے اندر نظام قائم کرنے کا فریضہ اس کا ہے۔ پروگرام کی کڑیاں یہ ہیں کہ جو قوم تمہارے سامنے ہے' ہم جانتے ہیں کہ وہ قوم مردہ ہے' اس پر مردنی چھا گئی ہوئی ہے لیکن پہلے یہ دیکھ لو کہ آیا اُس میں زندہ رہنے کی رمق ہے پہلے یہ دیکھ لو پھر یہ اگلی بات فَاَحۡیَیۡنٰہُ کی ہے کہ اُس قوم کو اُس کے بعد زندہ کرو' قرآن کی یہ شمع ہے جو اس کے ہاتھ میں دو کہ لو! چلو اب' تمہارے راستے بھی روشن ہوں اور انسانیت کے راستے بھی روشن کرتے چلے جاؤ۔ کہا یہ گیا کیا کہ کَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا (6:123) اس کے مقابلے میں وہ جو تاریکی کے اندر سو رہا ہے اور وہاں وہ تاریکی میں ہی رہنا چاہتا ہے' اسے تاریکی سے جو نکال دینا ہے' یہ ہے زندگی۔

تاریک راستوں کی نشاندہی جنہیں ترک کیے بغیر انسان صراطِ مستقیم کی طرف رجوع کر ہی نہیں سکتا

یہ تاریکی کیا ہے؟ یہ ہے خلافِ قرآن آپ کا معاشرہ' خلافِ قرآن آپ کے ہاں کے رسوم' آپ کے مناسک' آپ کے شعائر' آپ کا مذہب' آپ کی سیاست' آپ کے افراد کی عادات و کردار و اخلاق۔ یہ سب ظلمات ہیں' یہ سارا کچھ جو ہے خلافِ قرآن ہے' قرآن اس کو ظلمات کہتا ہے' کہتا ہے کہ جو ظلمات کے اندر ہیں انہیں ہم نے مردہ کہا ہے۔ اور اس کے برعکس ایک وہ ہیں جو یہ چیز کہیں کہ ہاں صاحب! تاریکی اچھی چیز نہیں ہے' ہم روشنی میں جانا چاہتے ہیں' ٹھیک ہے ان کو روشنی میں لے آؤ۔ لیکن جو چمگادڑ ہوں کہ روشنی سے ان کی جان جاتی ہو' ان کو تاریکی ہی پسند ہو کَمَنۡ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ لَیۡسَ بِخَارِجٍ مِّنۡهَا (6:123) ذرا قرآن کی بات کرو تو سارے معاشرے میں جناب دہائی مچا دی جائے کہ بتی روشن نہ کرنا' نیند اچاٹ ہو جائے گی' ہماری آنکھ کھل جائے گی۔ یہی

ہوتا ہے کہ روشنی میں نیند نہیں آتی۔ قرآن کہتا ہے کہ جس کی یہ حالت ہے کہ تاریکی راس آرہی ہے اور پھر روشنی کا سامان ہوتے ہوئے وہ کہتا ہے کہ اسے نہ روشن کرنا' بلب نہ جلانا' بتی نہ جلانا نیند اچاٹ ہو جائے گی' اسے تم روشنی کے متعلق کیا کہو گے۔

قوم کو زندگی بخشنے کے لیے' قرآنِ حکیم کے فلسفہ حیات کی اہمیت کو سمجھنے کی تڑپ پہلے پیدا کرنا ہوگی

پہلی چیز یہ ہے کہ اُس میں یہ تڑپ پیدا کرو' یہ آرزو پیدا کرو' یہ ولولہ بیدار کرو کہ تاریکی نہیں روشنی ہو۔ روشنی ایک ہی ہے عزیزانِ من! انسانیت کی دنیا میں وہ قرآن کی شمع ہے باقی سب تاریکی ہے۔ یہ آرزو' یہ خواہش' یہ تمنا کہ مجھے روشنی چاہیئے' یہ تڑپ پیدا کرو۔ تڑپ کا لفظ آ گیا تو پھر وہی اقبالؒ آ گیا' کیا کیا چیزیں کہہ گیا ہے!

ہو صداقت کے لیے جس دل میں مرنے کی تڑپ
پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے

یہ ہے فَاَحْیَیْنٰهُ ۔ جو پیکرِ خاکی ہے' یہ زندگی نہیں ہے۔ ابھی میں عرض کرونگا کہ قرآن ان زندوں کو کہتا ہے کہ آؤ تمہیں بتائیں کہ زندگی کیا ہوتی ہے۔ وہ ہے: ' پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے' اور اگلی بات پھر یہ کہی کہ

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار

دوسروں کے ہاں سے مانگ کر لیا ہوا جو کچھ جہان ہے پہلے اس کو پھونک دے۔ جو چیز آپ کے ہاں مذہب سے اور تصوف سے اور شریعت کے نام پہ مستعار چلی آئی ہے اور چلی آرہی ہے' جب تک اس کو پھونک نہیں دیا جائے گا' عزیزانِ من! قرآن کی روشنی نہیں آسکتی۔ یہ مستعار ہے' اسے پھونک ڈالے۔ یہ تو حصۂ لا ہو گیا:

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار
اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے

(اقبالؒ: بانگِ درا جوابِ خضر' زندگی)

یہ ہے پروگرام۔

مستعار لیے ہوئے تصورات کے تمام نشانات کو مٹا کر ہی جہانِ نو پیدا ہوگا

پہلے اپنے پیکرِ خاکی میں جاں پیدا کرے' پھر پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار' اسے ختم کرے اور پھر اس خاکستر سے آپ

اپنا جہاں پیدا کرے۔ یہ ہے عزیزانِ من! پروگرام جو قرآن نے بتایا ہے۔ یہ ہے فَاَحْیَیْنٰهُ (6:123) پہلے اس میں زندگی پیدا کرو۔ نبی اکرم ﷺ کی تیرہ سالہ مکے کی زندگی دیکھیے' کوئی کچھ کہہ رہا ہے' کوئی کچھ کہہ رہا ہے' چوں نہ بینند حقیقت رہِ افسانہ زدند' حقیقت سامنے نہیں آتی تو انسان افسانے تراشتا ہے۔ ہم نے افسانے تراشے ہوئے ہیں۔

نبی اکرمؐ کی تیرہ سالہ زندگی کی تگ وتاز اور کشمکشِ حیات کے عملی پروگرام کا مقصد ایک بنجر زمین کو قابلِ کاشت بنانا تھا

یہ زندگی کیا تھی؟ یہ پروگرام کیا تھا؟ حضور ﷺ کی بعثت کہاں ہوئی تھی؟ کس قوم میں آپ پیدا ہوئے تھے؟ ان تمام سوالات کے جوابات کے لیے آپ اُس قوم کی قبل از اسلام کی زندگی' جسے عہدِ جاہلیت کہتے ہیں' ظلمت کا زمانہ' اس پوری کی پوری قوم کی زندگی دیکھیے۔ اس میں زندہ رہنے کی آرزو تو تھی' صلاحیت تو تھی مگر اس میں زندگی نہیں تھی جسے قرآن کہتا ہے۔ وہاں یہ تیرہ سال حضور ﷺ کیا کرتے رہے؟ ان میں زندگی پیدا کرتے رہے' انہیں انسان بناتے رہے۔ یہ انسانیت سازی کی زندگی کا دور ہے۔ آپ اندازہ لگائیے کہ قبل از اسلام کی زندگی میں یہ ابوجہل اور عمر دونوں کس مقام پہ تھے' بعد کی زندگی میں تو آپ کو معلوم ہے کہ وہ عمرؓ کہاں تھے اور وہ ابوجہل کہاں تھا' پہلی زندگی میں دونوں کی کیفیت یہ تھی کہ حضور ﷺ نے دعا مانگی تھی کہ یا اللہ! اسلام کی تقویت کے لیے ابوجہل اور عمر میں سے ایک مجھے دیدے۔ وہ دونوں ایک مقام پہ تھے۔ پھر کیا ہوا؟ عمر آیا' وہ فاروقِ اعظمؓ بن گیا' ابوجہل نہ آیا جہالت کی زندگی جیا' جہالت کی موت مرا۔ کیا فرق ہوا پروگرامِ نبوی ﷺ کے ماتحت؟ اس مردہ کو زندگی عطا ہوگئی۔ آپ دیکھیں گے اس سورۃ کے اندر حیاتِ تازہ کے لیے کیا کیا پروگرام' کیا کیا مثالیں' کیا کیا استعارات استعمال کیے گئے! وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَةُ (36:33) کہا کہ اور سمجھنا چاہتے ہو۔ یہ بات کوئی فلسفے کی بات یا نظریئے کی بات' کوئی Academic قسم کی جو چیز ہے' یہ شاید تمہاری سمجھ میں نہ آئے۔ یہ بات تو سمجھ میں آتی ہے کہ ایک بنجری زمین ہوتی ہے' اُس بنجر زمین کو بنجر حیثیت میں چھوڑ دیا جائے' کتنا اچھا بیج ہو' ٹریکٹر چلا دیجیے' تھریشر لے آیئے' ہارویسٹر لے آیئے' اُس کے اندر پانی دیتے چلے جایئے' رکھوالی کرتے چلے جایئے' کچھ نہیں بنتا۔ کہا کہ اس زمین کو کرنا کیا ہوتا ہے؟ یہ کہ وَاٰیَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَیْتَةُ اَحْیَیْنٰهَا (36:33) اُس مردہ زمین کو پہلے اس قابل بناؤ کہ اس میں زندگی کی رمق پیدا ہو' کوئی کھاد اُس میں ڈالو' اس طرح سے کچھ پانی دو اور پوچھو جو زراعت کے قانون سے واقف ہیں کہ کس کس قسم کے نمکیات اور سالٹ اور کیا کیا مِنرل جو کچھ بھی وہ پروگرام بتائے' پہلے اُسے اس قابل بناؤ کہ جب بیج ڈالا جائے تو اس میں اُگ آئے۔ یہ ہے زندگی۔ یہ وہی الْاَرْضُ الْمَیْتَةُ مثال جو تھی قوم کی الْاَرْضُ' الْمَیْتَةُ اَحْیَیْنٰهَا پہلا مرحلہ یہ

ہے۔ اُسے اس قابل تو بناؤ۔ پھر جب یہ بنالو گے تو وَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهَا حَبًّا فَمِنۡهُ يَاۡكُلُوۡنَ - وَجَعَلۡنَا فِيۡهَا جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ (36:33.34) بس ذرا اُس کو اس قابل بنا دیجیے کہ جو کچھ اُس میں بوئیں' اُس میں سے اس کی نمود ہو جائے' پھر چلتے جاؤ کھیتی باڑی باغات پھل پھول ہر چیز اُس میں سے اگتی چلی جائے گی۔ اور اگر تم نے اس میتة کو میتة ہی چھوڑ دیا' تمہارے بیج کا بھی ستیاناس ہو جائے گا کسان کی ساری محنت رائیگاں چلی جائے گی کیونکہ اُس نے زمینِ مردہ کو زمینِ مردہ رہنے دیا تھا' کوئی کوشش بار آور نہیں ہو سکتی۔

مردہ قوموں کی برومندی اور حیاتِ نو کے لیے نبی اکرمؐ کی حیات ایک ماڈل کی حیثیت رکھتی ہے

یہ حضور ﷺ کی مکی زندگی اس زمینِ مردہ کو بار آور بننے کے قابل بنانے کے لیے تھی۔ اس کے لیے تیرہ سال لگے۔ یہ چند نفوس جن کی زمین مردہ بار آور ہوئی سوال اس میں تعداد کا ہے ہی نہیں۔ سوال تو یہ ہے کہ وہ انسان کس قسم کے بنے تھے۔ انسان بنانے کے لیے کوئی ماڈل سامنے ہونا چاہیے۔ آج اس ماڈل کے لفظ سے بات زیادہ سمجھ میں آتی ہے۔ یہ اچھی سے اچھی چیزیں جو آپ کی سمجھ میں آتی ہیں وہ ماڈل کے ذریعے سے ہی ہیں' وہ کہتے ہیں کہ پہلے ایک ماڈل ہوتا ہے اُس کو سامنے رکھ کر پھر یہ کچھ بنایا جاتا ہے۔ پہلا ماڈل کیا ہے؟ عزیزانِ من! یہ اس پروگرام کی کڑیاں ہیں' کہ زندگی کیسے پیدا ہوتی ہے۔ یہ انسانیت سازی ہے۔ ماڈل کیا ہے؟ کہا کہ یہ صِبۡغَةَ اللّٰهِ (2:138) ہے۔ خدا کو بطور نمونہ بناؤ' بطور ماڈل اپنے سامنے رکھو۔ اب وہ ماڈل تو محسوس ہونا چاہیے یہاں خدا کا رنگ کہا ہے۔ کہا ہے کہ بڑا حسین رنگ ہے' اس سے زیادہ خوبصورت رنگ ہی نہیں ہو سکتا۔ یہ کیا رنگ ہے؟ یہ وہی ہے جو صفاتِ خداوندی قرآن نے دی ہیں۔ یہ صفاتِ خداوندی' علیٰ حدِ بشریت ضروری بات ہے' یہ ایک بشر کے لیے جہاں تک ممکن ہو ان صفات کا اپنے اندر منعکس کرتے چلے جانا ہے' ان صفات کو اپنے اندر پیدا کرتے چلے جانا ہے۔

یہ ہے صِبۡغَةَ اللّٰهِ (2:138)۔ یہ قانونِ خداوندی سے یک رنگ و ہم آہنگ ہوتا ہے اور یہی ہے جسے کہا ہے کہ وَمَنۡ اَحۡسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبۡغَةً (2:138) اس رنگ سے زیادہ حسین رنگ اور کوئی نہیں ہو سکتا۔

کہا جاتا ہے کہ صاحب! اسلامی کردار کیا ہوتا ہے؟ اسلامی کیریکٹر کیا ہوتا ہے؟ یہ کہیں سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ کردار صِبۡغَةَ اللّٰهِ ہوتا ہے کہ خدا کی صفات علیٰ حدِ بشریت اپنے اندر پیدا کر لو۔ ان سے بڑی آسانی سے خود بھی آدمی ان کے متعلق اطمینان کر سکتا ہے کہ یہ صفات کتنی حد تک پیدا ہو گئی ہیں' اور دوسرے بھی دیکھ لیتے ہیں لیکن یہ پھر بھی ابھی نظری سی چیز تھی اس تربیت کے لیے جو مکے کی زندگی میں جو حضور ﷺ نے تربیت کی۔

حدِ بشریت صبغت اللہ کی ایک محسوس مثال آپ کی ذات تھی

پہلا مقدم کام یہ تھا کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21) سب سے پہلے رسول ﷺ نے اپنے آپ کو اس رنگ میں رنگا۔ اب تم اس محسوس شے کو دیکھو۔ اب یہ چیز تو ذہنی تھی کہ اس کا رنگ سبز ہونا چاہیے۔ سبز رنگ آپ نے پہلے کہیں دیکھا ہو تو پھر موازنہ ہو سکے گا کہ یہ سبز رنگا گیا ہے یا نہیں۔ یہ تو کسی محسوس کپڑے کے اوپر آئے گا تو پتہ چلے گا کہ یہ سبز ہے یا نہیں۔ وہ پیکرِ محسوس جو صبغت اللہ کے لیے ماڈل بنا وہ نبی اکرم ﷺ کا دوسرے انسانوں کے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ کہا ہے کہ لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (33:21) تم میں رسول اللہ کا کردار بہترین توازن بدوش نمونہ ہے۔ وہی جو حقیقتِ منتظر تھی وہ لباس میں نظر آ گئی' رسول ﷺ کی شکل میں سامنے آ گئی۔ اب ہم کہیں دھوکا نہیں کھا سکتے' کسی ابہام میں نہیں رہ سکتے' کسی شک وشبہ میں نہیں رہ سکتے کہ خدا کا رنگ کس قسم کا ہوتا ہے' اِس قسم کا ہوتا ہے یا اُس قسم کا۔ پہلے اپنے آپ کو اُس ماڈل کی حیثیت سے بنایا۔ اب یہاں سے بات شروع ہوتی ہے۔

نبی اکرمؐ کی ذات کے لیے لفظ مزمل کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! جس نے دوسرے کو اس راستے پہ چلانا ہے اس کے لیے کہا ہے کہ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (36:4) اُسے سب سے پہلے قائد بن کر چلنا چاہیے پھر Followers (متبعین) اُس کے پیچھے چلیں گے۔ پہلے اپنا نمونہ دکھایئے پھر دوسرے اس کی کاپی کریں گے۔ اور اسی لیے تو اس زندگی کے متعلق' حضور ﷺ کے متعلق یاایھا المزمل (73:1) کہا گیا یعنی ایسا مزمل جس میں تزمیل کا عمل بدرجہ اتم موجود ہو۔ یہ اُس کارواں سالار کو کہتے ہیں جو ایسے رفقائے سفر تیار کرے جن میں کامل ہم آہنگی اور یک رنگی ہو۔ اب ہمارے ہاں قافلے نہیں ہوتے اس لیے کارواں سالار کا بھی ذہن میں نقشہ نہیں ہوتا۔ کارواں سالار یہ نہیں ہوتا تھا کہ چار اونٹ اُس نے اکٹھے کر لیے' دس آدمی اکٹھے کر لیے اور تتا تتا کر کے چل پڑا۔ عربوں کے ہاں تو یہ کاروانیت بڑی اہم شے تھی۔ اس قسم کا قافلہ سالار یا کارواں سالار عجیب چیز تھی۔ ہوتا یہ تھا کہ ان کے ہاں اونٹ کے اوپر دو سواریاں بیٹھتی تھیں۔ اب ان کے ہاں بہترین کارواں سالار وہ ہوتا ہے جو نگاہ نگاہ میں ہی بھانپ لے کہ ان دو سواریوں نے آپس کی مصاحبت سے' رفاقت سے' ایک دوسرے کا ہمسایہ بن کر اتنا لمبا سفر کرنا ہے اور یہ دو ہی ہونے ہیں اس کے اوپر تیسرا ہونا ہی نہیں ہے۔ اگر ان میں ہم آہنگیٔ فکر ونظر نہیں ہے تو چار قدم بھی نہیں چل سکیں گے'' اونٹ والے نوں کہن گے ٹھہر جا مینوں اتر جان دے بھائی! [1]''۔ وہ قصہ یاد ہے کہ میر تقی میر (1723-1810) دہلی

---

[1] اونٹ والے کو کہیں گے کہ صاحب! ذرا ٹھہر جاؤ' بھائی! مجھے اس سے اتر جانے دو۔

سے آگرے کی طرف چلا تھا۔ اُس زمانے کے اِکے چلتے تھے تو وہ اتنی تو اس میں سکت نہیں تھی کہ سارا اکا ہی کرائے پہ لے لے۔ اتنے پیسے کہاں سے دئے' باقی سواریوں کے ساتھ بیٹھ گیا۔ دو تین اور سواریاں ساتھ تھیں۔ چلا تھا تو اُن سواریوں نے کہا کہ بھئی! ایسے کیسے سفر کٹے گا' باتیں کرتے چلے جانا چاہیے۔ اُنہوں نے باتیں شروع کیں' اسے بھی کہنے لگا۔ وہ تغلق کے باغ تک ہی ابھی گیا ہوگا تو اُس نے اکے والے سے کہا کہ بھائی صاحب! یہ لے لیجیے اپنا کرایہ اور مجھے اتار دیجیے۔ کہنے لگے: او کیوں' کیا بات ہوئی؟ کہنے لگے: بھائی صاحب! میں نے آگرہ جانے کے لیے یہ تم سے پیسے کا کیا تھا' زبان خراب کرنے کے لیے نہیں تھا' آگرہ تک جاتے جاتے تو میری زبان ہی بگڑ جائے گی۔ عزیزانِ من! وہ جو قافلہ سالار تھا' وہ اس کی احتیاط برتتا تھا۔ بڑی گہری چیز ہے جو میں کہہ رہا ہوں۔ جہاں جوڑا آپ نے بنانا ہو' پہلی چیز یہ دیکھیے کہ عملِ تزمیل رسول اللہ ﷺ نے کیا تھا جوڑا ایسا بنایا جائے جس میں ہم آہنگی فکر ونظر ہو اور ساری مسافت میں ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تنازع کی بات آپس میں نہ ہو' کوئی خلش نہ ہو آپس میں۔ زندگی کے کسی شعبے اور کسی سفر میں بھی آپ نے جوڑا بنانا ہے' یہ جوڑا بنایئے۔ یہ ہے یٰٓاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ (73:1) اس قسم کے جوڑے بنانے والے! اٹھ' قافلہ تیار کر۔ پھر آپ نے وہ جوڑے بنائے جو اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) حق کے مخالفین کے مقابلے میں چٹان کی طرح سخت ہیں لیکن باہم دگر بڑے ہی نرم اور ہمدرد ہیں۔

حضور نبی اکرمؐ سے پہلے عربوں کی معاشرتی اور تمدنی زندگی کی حالت' اسلامی نظام کی طرف دعوت اور دنیاوی ترامیم

عربوں کے قریش اور بدو کے ہاں ایک اونٹ کے تنازع پہ سو سو سال تک لڑائی چلا کرتی تھی' مرتے وقت باپ بیٹے سے کہہ جاتا تھا کہ اُس سے ہم نے قصاص لینا ہے' بھول نہ جانا۔ ان کی وصیتیں یہ ہوا کرتی تھیں۔ یہی تھے وہ سارے' یہی زمینِ مردہ تھی۔ آپ دیکھیے کہ آپ ﷺ نے ان میں کیا زندگی پیدا کی کہ وہ آپس میں رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ (48:29) بن گئے یعنی باہم گر بڑے ہی نرم اور ہمدرد۔ یہ کس چیز کا نتیجہ ہے؟ یہ مکے کی زندگی کی تربیت کا نتیجہ ہے۔ اور یہ زندگی پیدا کرنے کے لیے پھر کیا کیا مرحلے آتے تھے؟ سنیے! ایک مرحلہ تو ابھی عرض کر دوں یہ مقام آئیں گے تو میں عرض کرونگا۔ زندگی پیدا کرنے کے مقام وہ مقام ہیں جہاں جان دے کر زندگی خرید لی جاتی ہے۔ کبھی سنا ہے اس قسم کا پروگرام؟

کہا ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَجِيْبُوْا لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ (8:24) اے جماعتِ مومنین! اللہ اور رسول (نظامِ خداوندی) کی آواز پر لبیک کہو۔ یہاں يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ پکارا جا رہا ہے تو زندہ ہی تو ہیں' چلتے پھرتے ہوئے زندہ ہیں۔ آگے کہا ہے کہ اسْتَجِيْبُوْا

لِلّٰهِ وَ لِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ (8:24) اللہ اور اس کے رسول کی آواز پہ لبیک کہو جب وہ تمہیں بلائے۔ اب یہاں سوال یہ ہے کہ وہ کاہے کے لیے بلائے؟ کہا کہ لِمَا يُحْيِيْكُمْ (8:24) جب وہ زندگی دینے کے لیے تمہیں بلائے۔ یہ کہاں سے بلا رہا تھا؟ عزیزانِ من! بدر کے میدان سے آؤ' جان دے کر زندگی حاصل کرلو۔ دیکھ رہے ہیں کہ پروگرام بن رہا ہے۔ یہ کاہے کا پروگرام بن رہا ہے؟ یہ اسلامی نظام کے قیام کا پروگرام بن رہا ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ مکے کی زندگی میں یہ قائم نہیں ہوا' یہ قائم ہو ہی نہیں سکتا تھا' یہ کوئی Mechanical (میکانکی) چیز نہیں ہے' عزیزانِ من! جسے آپ یہ نظام کہتے ہیں۔ ٹھیک ہے دنیا کے نظام کے لیے Technically (تکنیکی طور پر) Legally (قانونی طور پر) اور Mechanically (میکانکی طور پر) آئین بنتا ہے کہ ووٹرز اس قسم کے ہونے چاہئیں' ان کی اتنی تعداد ہونی چاہیے' یہ عمر ہونی چاہیے' انتخاب کے بیلٹ اس قسم کے ہونے چاہئیں' انتخاب کے حلقے یوں بننے چاہئیں' اتنی سیٹیں Provinces (صوبوں) کی ہوں' اتنی Centre (مرکز) کی ہوں یہ ساری چیزیں' یہ ساری تفصیلات' یہ سب Mechanical (میکانکی) چیزیں ہیں' دنیا کی ہر قوم یہ کچھ کرسکتی ہے۔ تجربے سے اس میں وہ ترامیم بھی کرتی ہے' اصلاح بھی کرتی ہیں' بہترین Constitution (آئین) بنالیتے ہیں' لوگوں نے بنائے ہوئے ہیں ان کے ہاں چل رہے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک قرآنی نظامِ حیات کے قیام کے لیے انسان سازی کی تشکیل قدمِ اول ہے

اسلامی نظام اس قسم کی ٹیکنیکل جزئیات کا نام نہیں ہے۔ اسلامی نظام یہ ہے کہ اس کے پیچھے وہ انسان کس قسم کے ہیں جنہوں نے اس کو چلانا ہے۔ اس پہ بات ختم ہوگئی۔ یہ ساری چیزیں ضروری ہیں' بعد کی ہیں' پہلے وہ انسان تیار ہونے چاہئیں جنہوں نے اسے چلانا ہے اور اس کے لیے تو اُس نے جزئیات خود دی ہی نہیں ہیں' جن کی تلاش کرتے پھر رہے ہیں۔ وہ تو کہتا ہے کہ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) باہمی مشاورت سے جیسا جی چاہے بنالیجیے۔ یہ کون لوگ بنائیں گے؟ وہ لوگ جو تیار کیے گئے تھے جن کو زندہ انسان کہا گیا ہے۔ جب تک مکے کی زندگی میں یہ تیار نہیں ہوئے' کوئی Constitution (آئین) نہیں بنا۔ پہلے یہ جماعت تیار ہوگئی' پھر مملکت کی بنیاد بھی رکھی' پھر Constitution (آئین) بھی بنا' پھر اُس پہ عمل پیرا بھی یہ ہوئے' یہ میکانکی چیز نہیں ہے۔ وہ خوب کہتا ہے کہ 'نیست ایں کارِ فقیہاں اے پسر!' بیٹا! یہ قانون سازوں کی بات نہیں ہے' یہ انسانیت سازی کی بات ہے' یہاں سے ابتدا کرو۔ پہلی چیز یہ ہے کہ اس سفرِ زندگی کے اندر وہ آپ کے ہاں آپ کے ساتھ رفقاء کون سے ہیں؟ اللہ تعالیٰ کے الفاظ ہیں کہ محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہٗ ہیں' وہ اکیلا رسول نہیں بلکہ والذین معہٗ بھی ہیں' یہ معہ کہاں سے آگئے تھے؟ مکے میں جب

رسول ﷺ نے آواز دی ہے تو تنہا ہی تھے' اکیلے تھے' یہ مکے والے تو سارے ہی تھے یہ قریش ہی تھے جن کے اندر آپ تھے' انہی میں سے جن کو نکالا ہے وہ ہیں جن کو معہ کہا ہے۔ پہلے یہ سارے' جن کے اندر حضور ﷺ رہتے تھے ان کو تو معہ نہیں کہا۔ آپ نے غور فرمایا وہ سارے قریش آپ ہی کے خاندان کے' آپ ہی کی قوم کے' آپ ہی کے قبیلے کے' آپ ہی کے وطن کے' آپ ہی کی زبان بولنے والے' قومیت کے لیے جتنے معیار آج دنیا کہہ رہی ہے' وہ سارے موجود تھے محمد ﷺ اور ان کے اندر لیکن وہ محمد رسول اللہ ﷺ کے معہ نہیں بن سکے تھے۔ معہ تیرہ سال مکے کی زندگی میں انہی میں سے چن کر نکالے۔ یہ بنے وہ محمد ﷺ اور اس کے ساتھ جو رفیق تھے یہ اکٹھے ہوئے' تو اس کے بعد پھر وہ راستہ تو مشکل ہی کچھ نہیں ہوتا۔

منزل تک پہنچنے کے لیے کسی مخلص ساتھی کا ہم رِقاب ہونا ضروری ہے

کیا خوبصورت الفاظ میں بتا گیا ہے کہ

من از طریق نہ پرسم رفیق می جویم

میں تم سے یہ نہیں پوچھتا کہ راستہ کونسا ہے' میں یہ دیکھنا چاہتا ہوں کہ میرے ساتھ چلنے والا کونسا ہے

چہ گفتاں اندخستی رفیق و باز طریق

سیانوں نے یہ کہا ہے کہ پہلے سفر کے لیے ساتھ چلنے والا ساتھی ڈھونڈو پھر قرآن سے پوچھو کہ جی! راستہ کونسا جائے گا؟ یہ نظام یا Constitution (آئین) یا ان چیزوں کی یہ Details (تفاصیل) یا جزئیات یہ راستے ہیں۔ کہتا ہے کہ وَ الَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا (29:69) اس کے بعد جب تم راستہ معلوم کرنے کی ذرا سی کوشش کرو گے تو ایک راستہ کہتے ہو' ہم اُس طرف جانے والے تمہیں کئی راستے دکھا دیں گے۔ او! پہلے یہ بات کرو کہ وہ چلنے والے کونسے ہیں' اصحابِ کارواں کونسے ہیں؟ یہ مکینکل چیز نہیں ہے۔

فرقہ اہل قرآن کے نزدیک صلوٰۃ کے تصور کی نوعیت

عزیزانِ من! مکینکل سے یاد آ گیا۔ سیاست کی دنیا یا حکومت کی دنیا میں ہی نہیں بلکہ ہمارے ہاں دین کو مکینکل شعار کا مجموعہ سمجھنے والوں کا یہ ایک فرقہ پیدا ہوا ہے' جن کو اہل قرآن کہتے ہیں۔ پہلے تو ان کو چکڑالوی کہتے تھے۔ وہ اس سے ذرا چھینپ میں آئے تو اہلِ قرآن کہلانے لگے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ جو مسلمانوں کے اوپر تباہی آئی ہوئی ہے' بربادی ہے' ذلت ہے' خواری ہے' پستی ہے' یہ ساری جتنی بھی برائیاں آپ کہہ رہے ہو' یہ سب اس لیے ہے کہ یہ قوم پانچ وقتوں کی نماز پڑھتی ہے۔ پوچھا گیا کہ جی! اس کا علاج

کیا ہے؟ کہنے لگے کہ جی! تین وقتوں کی پڑھا کرو‘ ایک وقت میں ایک نماز کی ایک ہی رکعت یا غالباً دو رکعت‘ ایک سجدہ‘ بس یہ تبدیلی کردو۔ تبدیلی کر بھی دی۔ اُنہوں نے سمجھ لیا کہ تباہی‘ بربادی اور ذلت کا یہ سارا قصور اس کا ہے۔

قرآن کہتا ہے کہ صلوٰۃ کا جو مفہوم و مقصود و منتہا ہے‘ اس پہ نگاہ رکھو کہ آیا وہ ہو رہا ہے یا نہیں‘ وہ ہے اصل‘ وہ اگر نہیں ہو رہا تو صلوٰۃ قرآنی نہیں ہے اگر وہ مقصد‘ وہ Purpose‘ وہ نتیجہ پیدا کرتی ہے تو صلوٰۃ ہے۔ ادھر نہیں نگاہ گئی‘ وہ تو ان مصلین کو کہتا ہے کہ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّينَ . الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ (107:4.5) وہ نمازی تباہ ہو جاتے ہیں جو نماز کے مقصود سے غافل رہتے ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ مقصود وقصود کچھ نہیں‘ تین وقت کی ساری بات ہے‘ پانچ کی نماز تباہ کرے گی‘ تین وقتوں کی پڑھ لو‘ سب کچھ سنور جائیں گے۔ یہ اس فریب میں ہیں کہ یہ سارا قصہ جو ہے یہ مکینکل ہے۔

میکانکی طور پر ہر فرقے کی نماز کا طریق الگ الگ ہے

وہی چیز ہے جب ہم مذہب کی دنیا میں آتے ہیں تو انہوں نے یہ کچھ کہا۔ ہمارے ہاں ان کا نام تو میں نے لیا کہ وہ پانچ میں سے تین نمازیں لیتے ہیں۔ مسجدوں کے اندر جایئے‘ دیکھیے کہ یہ کیا چیز ہے؟ یہ مکینکل ہے‘ اہلِ حدیث کے ہاں حنفیوں کی نماز کیوں نہیں ہوتی؟ کیونکہ وہ اپنے ہاتھ نیچے باندھتے ہیں۔ ان کے ہاں کیوں ہوتی ہے؟ اس لیے کہ یہ اوپر باندھتے ہیں‘ وہ رکوع میں جاتے ہوئے سیدھے اللہ اکبر کہہ کر چلے جاتے ہیں‘ یہ یہ کر کے چلے جاتے ہیں یعنی یہ یہ کر لیجیے تو نماز ہوگئی‘ یہ نہ کیجیے نماز نہیں ہوئی‘ مکینکل ایکشن ہے‘ میکانکی چیزیں ہیں۔ یہ دیر کی‘ کسی زمانے کی بات ہے کہ میں نے ''مکینکی اسلام'' ایک پورا مقالہ لکھا تھا‘ اس کا عنوان ہی یہ تھا۔ یہ وہ تھا جس سے بہاولپور کے جج نے میرے اُس مضمون کی بنا پر مرزائیوں کو کافر قرار دیا تھا۔ یہ سب چیزیں مکینکل ہیں۔

انسانوں کے اندر روح پھونکنے کا کام خدا تعالیٰ نے انسانوں کے سپرد کر دیا ہے

قرآن‘ انسان تیار کرتا ہے‘ پہلے زمینِ مردہ کو وہ زندگی والی بناتا ہے‘ پہلے وہ کہتا ہے کہ جو مردہ ہے‘ پہلے اُس کو زندہ کرو‘ پھر اُسے قرآن کی روشنی کام دے گی‘ پہلے رفیق تیار کرو‘ وہ لوگ پہلے تیار کرو‘ وہ انسان پہلے تیار کرو۔ بڑی عظیم ذمہ داری ہے‘ عزیزانِ من! یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے کہ جس بات کو خدا نے خود نہیں براہِ راست دیا‘ اپنا کام ہمارے سپرد کیا ہوا ہے۔ یہ کوئی چھوٹی بات نہیں ہے وہ تو اس دنیا میں اپنے پیمانے کے اوپر خدائی کرنے والی بات ہے‘ خدا کے نظام کو نافذ کرنا انسانوں کے ہاتھ کی بات ہے۔ یہ مکینکل بات نہیں ہے آئین سازی نہیں ہے‘ انسان سازی ہے‘ عزیزانِ من! اور یہی چیز تھی جو پرکھ اور معیار ہے۔

انسانوں میں سے انسان کو پرکھنے کا طریق

حقیقت میں یہ جو ابھی میں نے کہا ہے‘ میں نماز روزہ میں اس کی کوئی تنقیص اور تحقیر نہیں کرنا چاہتا‘ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نگاہ جو

ہے وہ اس مقصد کے اوپر رکھو۔ ان میں سے ہر ایک Quote کرتا ہے' میں بھی بار بار حضرتِ عمرؓ (581-644/45) کا وہ قول بتایا کرتا ہوں جب آپؓ نے کسی ایک دعویدار سے کہا تھا کہ اپنی تائید میں کوئی قابل اعتماد آدمی بتاؤ۔ کہا تھا کہ کیا تم بطور شاہد گواہ لا سکتے ہو؟ اُنہوں نے کہا کہ جی ہاں۔ کہتےؓ لگے کہ وہ کون ہیں؟ وہ کہنے لگے کہ وہ فلاں شخص ہے۔ آپؓ نے کہا کہ قابلِ اعتماد ہے؟ کہنے لگے کہ جی بالکل قابلِ اعتماد ہے' بڑا پختہ مومن ہے۔ کہتےؓ لگے کہ کیا تم کبھی اس کی ہمسائیگی میں رہے ہو؟ کہنے لگے کہ جی نہیں۔ آپؓ کہنے لگے کہ کبھی اُس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ وہ کہنے لگے کہ نہیں آپؓ کہنے لگے کہ کبھی اُس کے ساتھ کوئی معاملہ کیا ہے؟ وہ کہنے لگے کہ نہیں آپؓ کہنے لگے پھر تمہیں کیسے پتہ ہے کہ وہ قابلِ اعتماد ہے' تم نے اُسے مسجد میں اٹھتے بیٹھے دیکھ لیا ہوگا اور سمجھ لیا کہ قابلِ اعتماد ہے۔ عزیزانِ من! یہ بڑی پتے کی بات ہے کہ معاملے میں دیکھو کیسا ہے' یہاں سے انسانیت کی پرکھ ہوگی۔ یہ ہیں انسان جو قرآن اسلامی نظام کے داعی تیار کرتا ہے۔

آج ہماری حالت ظہورِ اسلام سے پہلے عرب جیسے لوگوں کی سی ہے

عزیزانِ من! آپ کو مکی زندگی سے شروع کرنا ہوگا۔ نام کے اعتبار سے ٹھیک ہے ہم مسلمان ہیں' ایک قوم مسلمان کی ہے' معنوی اعتبار سے ہم وہیں ہیں جہاں زمانہ ظہورِ اسلام سے پہلے کے عرب عہدِ جاہلیت میں تھے۔ ان کے ہاں بھی یہ تھا کہ وہ خدا کو مانتے تھے۔ قرآن شاہد ہے کہ جب ان سے کہو کہ زمین و آسمان کس نے بنایا؟ وہ کہتے ہیں خدا نے بنایا تو وہ خدا کو مانتے تھے' عبداللہ تو ان کے ہاں نام ہوتا ہے' نبی اکرم ﷺ کے والد ماجد کا نام عبداللہ تھا۔ یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے منکر تھے۔ یہ سب چیزیں تھیں مگر انسانیت نہیں تھی۔ جسے قرآن زندگی کہتا ہے' وہ نہیں تھی لیکن اُس قوم کے اندر زندہ رہنے کی صلاحیت تھی۔ اُس زمینِ مردہ کو پہلے کاشت کے قابل بنایا' زندگی پھونکی' تڑپ پیدا کی' کردار پیدا کیا' جب وہ اس کسوٹی کے اوپر' باون تولے پاؤ رتی سونا' جسے کہتے ہیں' پورے اترے ہیں' پھر ان کو لے کر مدینے میں آ کر' یہ اعلان کیا کہ وہاں خدا کے نظام کی بنیاد رکھی جا رہی ہے۔

اس کرّہِ ارض پر انسانی زندگی کا وجود صرف انسانیت کے زیور سے ہی آراستہ ہے

یہ ہے وہ چیز' عزیزانِ من! جو اس سورۃ یٰسٓ میں آپ کو ملتی ہے' جہاں سے میں نے بات شروع کی تھی۔ کہا تھا کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) او! پہلی چیز یہ ہے کہ جن کے ذریعے سے تم یہ چاہتے ہو کہ یہ کام ہو' پہلے دیکھو تو سہی کہ ان میں زندہ رہنے کی صلاحیت بھی ہے' پھر پہلا پروگرام وہ بناؤ' زندگی پیدا کرو' ان کے ہاں انسانیت پیدا کرو۔ انہی میں سے لے کر اُسی Stuff (مواد) میں سے' اُسی قوم میں سے لے کر' ان میں انسانیت پیدا کرو۔ آپ ﷺ نے بھی اُسی قریش میں سے کہیں لیے تھے' باہر سے نہیں لیے

تھے' انہی میں سے لیے تھے۔ اس پروگرام کے تابع' عزیزانِ من! جب انسان بنائیں گے اور ان کا معیار وہ نہیں ہوگا جو ابھی ابھی بتایا ہے کہ صاحب! بڑا نمازی پرہیز گار ہے' وہ بھی اپنی جگہ درست ہے' مگر مقصود اور منتہا یہ ہے کہ وہ معاملات میں کیسا ہے۔ قرآنِ کریم میں چار لفظوں کے اندر ساری بات آجاتی ہے کہ رفیق کیسا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ آیا وہ صِبۡغَةَ اللّٰهِ (2:138) قانونِ خداوندی سے یک رنگ و ہم آہنگ ہو جانے کا انعکاس' اس کے کردار و افعال اور سیرت سے ہوتا ہے یا نہیں' وہ ماڈل نبی اکرم ﷺ کا وہ اسوۂ حسنہ جو قرآن نے بتایا ہے' اس کا عکس سیرت و کردار میں نظر آتا ہے یا نہیں۔ یہ اس کی ابتدا ہوگی جو اسلام کے نظام کی دعوت دیگا اور پھر اس کا اگلا پروگرام یہ ہوگا کہ یہ جتنے لوگ لبیک کہہ کر آنے والے ہیں' وہ اُن کی انسانیت سازی کرے۔ قرآنِ کریم میں سورۃ حدید میں جو ہے' جب میں وہاں آؤنگا' وہ وہاں بڑی عجیب کڑیاں گنائی گئی ہیں' وہ سامنے لاؤں گا۔

رسول اکرمؐ کی تعلیم کا پہلا مرحلہ: دلیل و براہین لانا ہے

کہا ہے کہ وَلَقَدۡ اَرۡسَلۡنَا رُسُلَنَا بِالۡبَيِّنٰتِ (57:25) انسانی صلاحیتوں کی نشوونما کے مقصد کے حصول کے لیے خدا نے ایسا انتظام کیا ہے کہ اس نے مختلف اقوام کی طرف' اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا۔ اسی طرح رسول کی جو پہلے تعلیم ہے اس میں وہ Reason, Rationalism' حکمت' فکر' بینات' دلائل پیش کرتا ہے۔ یہ پہلا مرحلہ قوم کی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما ہے۔ عزیزانِ من! فکری صلاحیتوں کی نشوونما' آزادئ فکر کی نشوونما' دلائل و براہین کی رو سے پیدا ہوتی ہے۔ رسولوں کا پہلا پروگرام جو قرآن نے کہا ہے' وہ یہ ہے کہ وہ آکر بینات دیتے تھے' ہر بات کو وہ عقل و فکر کی رو سے' دلائل و براہین کی رو سے' سمجھاتے تھے' پیش کرتے تھے۔ اس سے انسانیت کی بڑی برومندی ہوتی ہے عزیزانِ من! اگر آپ سے غور اور فکر کی رو سے بات کی جائے اور آپ سے بھی کہا جائے کہ هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ (2:111) بھئی! جھگڑنے کی بات نہیں۔ تم بھی دلیل لاؤ' میں تم سے ڈنڈے کے زور پر کچھ نہیں منواتا۔ تمہیں اجازت ہے کہ دلیل پیش کرو۔ مخالفین سے رسول کہہ رہا ہے کہ لاؤ' میرے سامنے دلیل لاؤ۔ یہ قدم اول ہے' مرحلہ اول ہے۔

بینات سے مطمئن ہونے والوں کے لیے دوسرا مرحلہ: ضابطۂ قانون کی صداقت کو ماننا ہے

جب بینات سے مطمئن ہونے کے بعد کچھ لوگ اس طرف آجائیں' اس کی بات پہ دھیان دیں' اس کے ساتھی بننے کے لیے رضامند ہو جائیں تو آگے کہا ہے کہ وَاَنۡزَلۡنَا مَعَهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡمِيۡزَانَ لِيَقُوۡمَ النَّاسُ بِالۡقِسۡطِ (57:25) ہر رسول اپنے ساتھ ضابطۂ قوانین لاتا۔ وہ اس ضابطۂ قوانین کی رو سے ایسا معاشرہ قائم کرتا جس میں ہر شخص کا عمل ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرے اور

یوں لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ یہاں یہ بتایا ہے پھران کو ضابطۂ قانون دیا جاتا ہے۔ یہ اس پروگرام کی اگلی کڑی ہے۔ پہلی کڑی میں قانون کی رو سے یہ کچھ کرنے کی بات نہیں ہے۔ پہلی کڑی عقل وفکر کی رو سے' دل و دماغ کی کامل رضا مندی سے' یہ ہے کہ وہ اس کو مانیں کہ یہ واقعی صداقت ہے' پھر اس بنا پہ آپ جو قانون دیں گے' اس قانون کے لیے تو وہ جانیں دیدیں گے جن کے متعلق ان کا قلب اور دماغ مطمئن ہے کہ یہ واقعی حق پر مبنی قانون ہے۔

دلائل و براہین پر مبنی تعلیم کے بعد تیسرا مرحلہ: میزان عدل کا قیام اور شمشیر خارہ شگاف کا مقام

عزیزانِ من! پہلی چیز بینات ہے' دوسری چیز ضابطۂ قانون ہے اور اس کی صداقت کو ماننا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ کہا ہے کہ **لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ** (57:25) تا کہ وہ دنیا میں میزانِ عدل قائم کرسکیں۔ اور اس کے بعد اگلی چیز ہے کہ پھر جہاں ایسے مخالفین آجائیں کہ وہ عدل نہ قائم ہونے دیں' دنیا کے اندر دھاندلی مچاتے والے ہوں تو کہا کہ **وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ** (57:25) پھر اس کے بعد ان کے لیے ہم نے تلوار بھی نازل کی ہے۔ یہ تینوں چیزیں منزل من اللہ ہیں لیکن ان کی ترتیب یہی ہے' پہلے ہی تلوار نہیں شروع ہوجاتی' پہلے ہی قانون نہیں شروع ہوجاتا' پہلے بینات شروع ہوتے ہیں۔ اسی کو تو تعلیم کہتے ہیں۔ وہ جو تعلیمِ حکمت ہے' کتاب کی تعلیم ہے' وہ تو بعد میں آتی ہے' یہ جسے آپ حکمت کہتے ہیں' اُس کو Reason کہا جاتا ہے' ایک چیز کو Rationally منوانے کو کہا جاتا ہے۔ اس طرح سے آپ ﷺ کا جو پروگرام تھا' اس سے وہ قوم کو زندہ قوم بناتے تھے۔ کہا کہ اس طرح سے جب یہ چیز پیش کی جائے اور ان میں سے انہیں دیکھ لیا جائے جن میں زندہ رہنے کی صلاحیت ہوگی تو وہ چھٹ کر الگ ہوتے چلے جائیں گے' وہ آتے چلے جائیں گے' وہ تمہارے ساتھی ہونگے' جو باقی ہیں ان کے اوپر اتمامِ حجت ہوجائے گا۔

واضح دلائل و براہین کو نہ ماننے والوں کے متعلق خدا کا ارشاد

رسول اکرم ﷺ تیرہ سال تک اپنی یہ دعوت دیتے رہے۔ رسول اللہ ﷺ کا مکے میں یہ کچھ کم عرصہ نہیں تھا لیکن مخالفین کی کیفیت یہ تھی کہ بجائے اس کے کہ غور وفکر سے کام لیتے اور اس ضابطہ قانون (قرآنِ کریم) کو سمجھنے کی کوشش کرتے' انہوں نے **لَقَدْ حَقَّ الْقَوْلُ عَلٰٓى اَكْثَرِهِمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ** (36:7) کہہ کر اس سے انکار کردیا کہ چونکہ یہ اس راستے کی طرف دعوت دیتا ہے جو ہمارے آباؤ اجداد کی روش کے خلاف ہے' اس لیے ہم اسکی مخالفت کریں گے اور یہ مسلمہ قاعدہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کی روش اختیار کرلیں وہ حق وصداقت کو کبھی تسلیم نہیں کیا کرتے۔ یہی قاعدہ ان کی صورت میں بھی صحیح ثابت ہوا۔ اُدھر واضح دلائل و براہین دے کر ہم نے اپنی طرف سے اتمامِ حجت کردیا' ہم نے اس کے لیے پورا پورا زور لگا دیا' اگر یہ اس کے باوجود سیدھے راستے پہ نہیں آتے تو

اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ حضور ﷺ کے متعلق بھی قرآن نے یہ بتایا' اللہ تعالیٰ نے حضور ﷺ سے کہا ہے کہ تم ان کی طرف سے کیوں زچ پڑتے ہو' تمہارا فریضہ انہیں راستے پر چلا دینا نہیں ہے' تمہارا فریضہ بس وہ صحیح راستے کی نشاندہی کر دینا ہے۔ یہاں تو زبردستی کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ جوان میں سے آ کر ساتھ نہیں ملے ہیں' وہ اس صداقت کے اوپر ایمان نہیں لائے تو ٹھیک ہے وہ تباہ ہونگے۔ کہا ہے کہ یہ اس انداز سے یہ راستہ طے کرتے ہیں۔ کیا بات ہے' عزیزانِ من! یہ جو حق کی آواز پہ نہیں آتے ان کے لیے ایک ہی دلیل ہے' اگر اُسے دلیل کہا جائے تو ایک ہی دلیل ہوتی ہے کہ یہ ہمارے اسلاف کا راستہ ہے ہم نے ان کو اسی طرح سے پایا ہے اور ہم اُس پہ چلے جائیں گے۔ اور جو آپؐ لیتے ہیں وہ اس روش کے خلاف ہے جس پہ ہمارے آباؤ اجداد چلتے تھے۔

تقلید پرستی انسانی عقل کو ماؤف کر دیتی ہے تو پھر جہالت کا طوق اس کی گردن میں لٹکا دیا جاتا ہے

راستہ چلنے والے کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ وہ اپنے پاؤں کے سامنے یہ دیکھے کہ اس کے سامنے جو راستہ ہوتا ہے یہاں وہاں کوئی خطرے والی بات تو نہیں' کوئی سانپ سپولیا تو نہیں' کوئی کھڈ تو نہیں' وہ یہاں نیچے دیکھے لیکن اگر اس کی صورت یہ ہو کہ کوئی ایسی شکل پیدا کی جائے کہ وہ اپنے پاؤں دیکھ ہی نہ سکے اور اُس کے دیکھنے کی بات دور تک رہے' تو اب وہ خطرے سے آگاہ نہیں ہو سکتا۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے بات بتا دی۔ کہا کہ یہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم سے پہلے جو ہمارے ہاں کے اسلاف گزرے تھے' ہم تو ان کے راستے پہ چلتے ہیں۔ آگے کہا ہے کہ **اِنَّا جَعَلْنَا فِیْٓ اَعْنَاقِهِمْ اَغْلٰلًا فَهِیَ اِلَى الْاَذْقَانِ فَهُمْ مُّقْمَحُوْنَ (36:8)** جو لوگ اندھی تقلید کی روش اختیار کر لیتے ہیں ان کی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے جیسے کسی کی گردن میں طوق ڈال دیا جائے جس سے اس کا سر اوپر کی طرف اٹھا رہے اور وہ اپنے سامنے کا راستہ دیکھ ہی نہ سکے۔ اب یہاں ہم نے طوق کہا ہے۔ شاید اس سے بات سمجھ میں نہیں آئے گی۔ آج کل یہاں گردن' پٹھوں میں بعض مرض پیدا ہو جاتے ہیں تو ڈاکٹر ایک قسم کا وہ یوں پٹا سا [1] پہناتے ہیں وہ اس طرح کا گول سا ہوتا ہے' آپ نے دیکھا ہوگا۔ اب اس سے ہوتا یہ ہے کہ وہ مریض اپنے پاؤں کی طرف نہیں دیکھ سکتا اوپر تو نظر ہوتی ہے' نیچے نہیں دیکھ سکتا۔ کہا یہ ہے کہ یہ جو تقلید کے اندر چلنے والے ہیں ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کے گلے میں وہ اس قسم کا پٹا پڑا ہوا ہے' اس کی اپنی جو حال کی زندگی ہے' جو اس کا Present ہے' وہ اس کی طرف دیکھ سکنے کے قابل ہی نہیں ہوتے۔ وہ پٹا ہے جو گلے میں پڑا ہوا ہے۔ کیا کیا انداز ہے اس کے سمجھانے کا! کہتا ہے کہ چل رہے ہیں اور سر اوپر کا اوپر ہی ہے۔ کسی کو اس طرح چلا کر دیکھیے ''او جاندا اے''؟ [2] کہتا ہے کہ اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ **وَ جَعَلْنَا مِنْۢ بَیْنِ اَیْدِیْهِمْ سَدًّا وَّ مِنْ خَلْفِهِمْ سَدًّا فَاَغْشَیْنٰهُمْ فَهُمْ لَا**

---

[1] اسے Neck Collar کہتے ہیں۔

[2] کیا وہ جاتا ہے؟

یُبۡصِرُوۡنَ (36:9) جب سر ہی اونچا ہوگیا تو یہ آگے خود دیوار کھڑی ہوگئی۔ تاریخ کی رو سے ماضی کے اندر جو انہوں نے کچھ سبق سیکھنا تھا کہ ان اقوامِ گزشتہ کے ساتھ کیا ہوا' اُنہوں نے کیا کیا تھا' ان کی کیوں تباہی آئی' یہ نگاہ اُدھر بھی نہیں گئی' اپنا ماضی تو ان کو بہت شاندار نظر آتا ہے۔

عزیزانِ من! اسے مثال سے سمجھو۔ جب ان سے بات کرو تو وہ ہارون رشید کے زمانے کی بات سنا دیں گے کہ صاحب! سبحان اللہ کیا بات ہے! ارے بھئی! دیکھو تو سہی کہ آئن سٹائن (1879-1955) نے کیا کیا' لو جی! آئن سٹائن نے کیا کیا ہے!!! جناب! ہمارے ہاں ابنِ آدم تھا۔ اُس نے یہ بات کہی تھی۔ کہتا ہے کہ نہ تو ادھر کے متعلق ان کے ہاں کچھ تحقیق ہوتی ہے' جو تنقید ہوتی ہے تو اُدھر دیوار کھڑی ہوئی ہے' آگے دیکھ نہیں سکتے۔ کہنے لگے کہ اندازہ لگایئے! پیچھے بھی دیواریں ہیں' ماضی سے سبق نہیں لے سکتے' آگے دیواریں ہیں کہ حال اپنے پاؤں میں دیکھ ہی نہیں سکتے اور اس کے بعد یوں دیواریں کھڑی ہیں اور اوپر یوں کنٹوپ پہنا ہوا ہے' آنکھوں پہ حضرت صاحب کی عقیدت مندی کی یوں پٹی بندھی ہوئی ہے۔ کہنے لگے کہ پھر اس کا جو نتیجہ ہوتا ہے' وہ ہم سے نہ پوچھو' چلنے والے سے پوچھو اور اس کو دیکھو کہ **فَهُمۡ لَا يُبۡصِرُوۡنَ (36:9)** بصارت ہی ختم نہیں ہوتی' بصیرت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ لہٰذا ان کے متعلق آخری لفظ میں کہہ دوں کہ **وَ سَوَآءٌ عَلَيۡهِمۡ ءَاَنۡذَرۡتَهُمۡ اَمۡ لَمۡ تُنۡذِرۡهُمۡ لَا يُؤۡمِنُوۡنَ (36:10)** جن کا Attitude (رویہ) اور Mind (ذہن وفکر) یہ ہو جائے کہ نہیں صاحب! جس راستے پہ چلتے آ رہے ہیں' ہم اس کو چھوڑنے کو تیار ہی نہیں ہیں' ہم تمہاری سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو کہا ہے کہ اس کے لیے یہ برابر ہے کہ تم اس کو خطراتِ راہ سے آگاہ کرو یا نہ آگاہ کرو' اُس نے تو پہلے سے فیصلہ کر رکھا ہے کہ تمہاری سننی ہی نہیں ہے۔ اسے آگاہ کرنا یا نہ کرنا برابر ہے۔ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! خدا نے ان کے لیے یہ کہہ دیا ہے کہ سناؤ یا نہ سناؤ ان کے لیے برابر ہے' ان کو سنانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ تو روزمرہ کا محاورہ ہے کہ سورج چڑھنے کے ساتھ جو شخص اپنی آنکھیں بند کر لے تو آپ کہتے ہیں اُس کے لیے برابر ہے کہ سورج چڑھے یا نہ چڑھے۔ وہ محاورہ ہے یعنی اس نے اپنی جو کیفیت اپنے اوپر طاری کی ہے' اُس کا نتیجہ یہ ہے کہ سورج چڑھے یا نہ چڑھے' اُس کے لیے برابر ہوتا ہے۔ یہ ہے محاورہ۔ تو ایسا شخص جو سننا ہی نہیں چاہتا' جو اپنے راستے کو چھوڑنا ہی نہیں چاہتا' دلیل ہی یہ ہے کہ جیسے پہلی بھیڑیں جا رہی ہیں' میں ان کے پیچھے پیچھے جا رہا ہوں' ان کو تمہارا پیغام کیا فائدہ دے گا۔ لہٰذا ایسے لوگ نہ دلائل و براہین سے کام لیتے ہیں کہ آنے والے واقعات کا جائزہ لیں کہ صحیح راستہ اختیار کر لیں اور نہ ہی تاریخی شواہد کا مطالعہ کرتے ہیں کہ گزرے ہوئے واقعات ہی سے استنباط نتائج کر لیں۔ ان کے آگے بھی جہالت کی دیوار کھنچ جاتی ہے اور پیچھے بھی۔ اس طرح ان کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں اور وہ بصیرت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ ہے جسے قرآن کریم نے **وَ جَعَلۡنَا مِنۡۢ بَيۡنِ اَيۡدِيۡهِمۡ سَدًّا وَّ مِنۡ خَلۡفِهِمۡ سَدًّا فَاَغۡشَيۡنٰهُمۡ فَهُمۡ لَا**

یُبْصِرُوْنَ (36:9) کہا ہے۔ ان کے لیے یکساں ہے کہ انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے' وہ **لا یومنون** (36:10) کبھی صداقت کو تسلیم نہیں کرتے۔ آگے کہا کہ **اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ وَ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ ۚ فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ اَجْرٍ كَرِيْم** (36:11) غلط روش کے نتائج سے تنبیہ کا فائدہ تو انہیں ہی پہنچ سکتا ہے جو عقل وفکر سے کام لے کر قانونِ خداوندی کا اتباع کریں اور اس کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خائف ہوں قبل اس کے کہ وہ نتائج ان کے سامنے آ جائیں۔ اے رسول! تو ایسے اشخاص کو صحیح روشِ زندگی کے خوشگوار نتائج کی خوش خبری دے اور انہیں بتا دے کہ زندگی کے تمام خطرات سے ان کی حفاظت ہوگی اور ان کی محنت کا بڑا باعزت بدلہ ملے گا۔

عزیزانِ من! سورۃ یٰسٓ کی آیت دس تک ہم آئے۔ میں نے اتنا تلاوت کرنے کے بعد یہ کچھ کہہ کر اس لیے چھوڑ دیا ہے کہ بات تو آگے آئی کہ **اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى** (36:12) یہ ہے بات مُردوں کو زندگی دینے والی۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ

دوسرا باب: سورۃ یٰسٓ (آیات 11 تا 27)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1980ء کی 20 تاریخ ہے اور درس کا آغاز سورۃ یٰسٓ کی آیت 11 سے ہو رہا ہے: (36:11)۔

قرآنِ حکیم مُردوں کو زندہ کرنے کے لیے آیا تھا' زندوں کو موت سے ہم کنار کرنے کے لیے نہیں

سورۃ یٰسٓ کے متعلق تو میں نے پچھلے درس میں بلکہ اس سے پہلے بھی یہ عرض کیا تھا کہ ویسے تو سارا قرآن ہی حیات آور ہے لیکن اُس میں بعض سورتیں ایسی ہیں جن میں خاص طور پر یہ موضوع ہوتا ہے اور ان میں یہ سورۃ یٰسٓ بھی ہے۔ ہماری بدنصیبی دیکھیے کہ یہ ایسی سورۃ جو نویدِ حیات آور تھی اُسے ہم نے پیامِ مرگ قرار دے رکھا ہے۔ سورۃ یٰسٓ کا نام ہی ذہن میں آتا ہے تو ایسے ہوتا ہے جیسے کسی مردے کے سرہانے بیٹھے ہوئے ہوں لیکن آپ دیکھیں گے کہ قدم قدم یہ سورۃ یہ بتاتی ہے کہ مُردوں کو زندہ کیسے کیا جاتا ہے' یہ نہیں کہ زندوں کو مارا کیسے جاتا ہے۔ پچھلے درس میں موضوع ہی قریباً یہ تھا کہ قرآنِ کریم کی رو سے مُردہ قوموں کو زندہ کیسے کیا جاتا

ہے اور وہاں ہم نے قرآن کی رو سے موت اور حیات کی تعریف (Definition) اور خصوصیت بھی بیان کر دی تھی۔ سلسلۂ کلام اُسی طرح جاری رہے گا لیکن سابقہ آیت میں یہ کہا گیا تھا کہ یہ پیغامات ہم دیتے چلے جاتے ہیں لیکن جو سننا ہی نہ چاہے' اُنہیں یہ پیامِ حیات آور کیا فائدہ دیں گے' ان کے لیے برابر ہے کہ انہیں ان کی موت کے خطرات سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ جو خودکشی پہ تلا بیٹھا ہو اُس کو یہ کہنا کہ یہاں چھلانگ نہ لگانا' پانی ڈبو دینے والا ہے بے کار ہے۔ اس کے لیے یہ سوال ہی نہیں ہے۔ کہا کہ یہ ان کو فائدہ دے گی جو زندہ رہنا چاہتے ہیں۔

قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں اطاعت کی بجائے اتباع کا لفظ استعمال کیا ہے

اس سے پہلے کہا تھا کہ جو بصارت اور بصیرت سے محروم ہو جاتے ہیں ان کے لیے یکساں ہوتا ہے خواہ انہیں ان کی غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کیا جائے یا نہ کیا جائے' وہ صداقت کو کبھی تسلیم نہیں کرتے۔ اب سوال یہ ہے کہ غلط روش کے نتائج سے تنبیہ کا فائدہ کس کو ہوتا ہے؟ کہا ہے کہ اِنَّمَا تُنْذِرُ مَنِ اتَّبَعَ الذِّكْرَ (36:11) یہ جو ''الذکر'' ہے یہ چیز اُن کو ان چیزوں سے آگاہ کرنے کا ضابطہ ہے کہ سفرِ حیات میں کونسے خطرات ہیں۔ ان سے وہی فائدہ اٹھا سکیں گے جو اس ''الذکر'' کے پیچھے پیچھے چلیں گے۔ پُر خطر راستے میں اگر آگے چلنے والا خطرات سے آگاہ ہو تو اُس کے پیچھے پیچھے چلے جانے والا ان خطرات سے محفوظ رہتا ہے۔ اسی لیے یہاں مَنِ اتَّبَعَ ہے۔ ''تبع'' اور ''اطاعت'' میں فرق ہوتا ہے۔ اطاعت تو از خود بھی کسی حکم کی تابعداری یا Obedience کی جا سکتی ہے' اتباع ہوتا ہے کسی کے پیچھے پیچھے چلنا۔ تو کہا یہ گیا تھا کہ یہ جو سفرِ زندگی ہے' اس میں بہت سے خطرات ہیں' بہت سے ایسے مقامات آتے ہیں جہاں سے تمہیں بڑی حفاظت سے قدم رکھ کر آگے چلنا ہوگا اور اس کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ جو خطرات سے آگاہ' تمہارے آگے آگے جانے والا ہو' اُس کے پیچھے پیچھے چلتے جاؤ۔ اور وہاں صرف ''الذکر'' کہا ہے' آگے جانے والا بھی کوئی شخص نہیں ہے بلکہ یہ ضابطۂ حیات ہی ہے اس لیے کہا ہے کہ اس کے پیچھے پیچھے چلتے جاؤ۔

ہمارے ہاں کے تراجم نے قرآنِ حکیم کا مفہوم مسخ ہی نہیں کیا بلکہ اس کو اُلٹ کر بھی رکھ دیا ہے

وہ جو اس کے پیچھے پیچھے چلے گا اُس کی خصوصیت یہ بتائی کہ وَ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (36:11)۔ اب ہمارے ہاں تو جیسے آپ سنتے چلے آ رہے ہیں کہ یہ جو قرآن کی اصطلاحات ہیں' ان کے غلط مفہوم نے نہ صرف یہ کہ قرآن کا مفہوم مسخ کر دیا ہے بلکہ بعض اوقات تو بالکل اُس سے الٹ' الگ اور مختلف معنی سامنے آتے ہیں۔ سورۃ الفاتحۃ کے بعد پہلے ہی جہاں قرآن شروع ہوتا ہے' کہا ہے کہ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ (2:2) اس ضابطۂ قوانین کے اندر نہ بے چینی اور تذبذب ہے اور نہ کوئی نفسیاتی

الجھن۔ اُس کے بعد کہا ہے کہ هُـدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ - الَّـذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ (2:2.3)۔ یہ وہیں يُـؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ آیا ہے' بس وہاں سے یہ معنی لیتے ہیں کہ وہ غیب پہ ایمان لاتے ہیں اور غیب پہ ایمان کے معنی ہوتے ہیں کہ جو غیب ہے' اُس کے اوپر ایمان' جسے اَن دیکھے پہ ایمان کہتے ہیں۔ اُس ایمان میں تو عقل و بصیرت اور علم و برہان کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہوتی اسی لیے وہاں یہ ایمان بالغیب کے معنی لیتے ہیں کہ بس وہ تو ہوتا ہی ایسے ہے کہ بس مان لینے والی بات ہے' وہ تو غیب پہ ایمان ہوتا ہے۔ اس سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔

ایمان بالغیب کا مفہوم کیا ہے؟

قرآن کی رو سے اس ''غیب'' کے معنی ہوتے ہیں ''جو کچھ آپ اس وقت کرتے ہیں' اُس کا فوری نتیجہ آپ کے سامنے نہیں آتا' کچھ وقت کے بعد جا کر اُس کا نتیجہ محسوس شکل میں سامنے آتا ہے''۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ مرتب تو اُسی وقت ہونا شروع ہو جاتا ہے لیکن ابھی وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے' Visible Form میں' محسوس مرئی شکل میں' نہیں آتا' ابھی وہ تمہاری نگاہوں سے اوجھل ہوتا ہے اور کچھ عرصہ کے بعد جا کر' اس کام کا وہ غیر محسوس' غیر مرئی (Invisible) نتیجہ محسوس شکل میں تمہارے سامنے آتا ہے۔ اُسے مشہود کہتے ہیں۔ اب یہ چیز ہے کہ یہ جو غلط کام کیا ہے اس کا نتیجہ تخریبی نکلے گا تو وہ فوراً سامنے نہیں آیا' کچھ عرصے کے بعد جا کر وہ محسوس شکل میں سامنے آئے گا۔ فوری طور پر اس چیز پہ یقین کہ یہ جو غلط کام ہے اس کا غلط نتیجہ تخریبی نتیجہ نکلے گا' اسے کہتے ہیں ایمان بالغیب۔ مثلاً کسان کا یہ ایمان ہے کہ جو دانہ آج میں نے بویا ہے' یہ ایک پیڑ بنے گا یا فصل بنے گی' ایک ایک دانے سے سو سو دانے نکلیں گے۔ یہ اُس کا یقین ہے جو چھ مہینے تک اس کو مسلسل اس محنت پر آمادہ کیے رہتا ہے جس محنت کا محسوس نتیجہ ابھی اُس کے سامنے نہیں آ سکتا۔ یہ اتنا عرصہ جو کچھ وہ مسلسل سعی و عمل کر رہا ہوتا ہے وہ اس غیب پر ایمان ہے کہ یہ دانہ صحیح تھا' زمین صحیح ہے' قانونِ زراعت کے مطابق میں کوشش کرتا ہوں' یقیناً اس ایک دانے سے سو سو دانے مجھے لیں گے۔ اُس کسان کا یہ یقین ''ایمان بالغیب'' کہلاتا ہے۔ اپنے ہر عمل کے متعلق یہ یقین کہ یہ عمل نتیجہ خیز ہو کر رہے گا' اگر یہ خدا کے قانون کے مطابق ہے تو تعمیری نتیجہ نکلے گا' اگر اُس کے خلاف ہے تو تخریبی نتیجہ نکلے گا' ابھی تو وہ نتیجہ میرے سامنے نہیں ہے لیکن یقیناً نکلے گا۔ اسے کہتے ہیں غیب پر ایمان۔

انسانی ذات کو سب سے زیادہ پامال کرنے والی شے خوف و حزن ہے

یہاں کہا ہے کہ خَشِيَ الـرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ (36:11) اس کا ترجمہ آپ کے سامنے ہے۔ یہ جو خَشِيَ اور تقویٰ اور خوف کے ترجمے ہوتے ہیں' میرے بھی سامنے ہے۔ اس کا ترجمہ کسی قرآن سے دیکھ لیجیے' لکھا ہے کہ وہ ڈرتے ہیں رحمٰن سے غیب میں۔

اس میں ایک تو ڈر کی بات ہے‘ عزیزانِ من! سب سے زیادہ جو انسانیت کو کچلنے کی چیز ہے‘ وہ ڈر ہے۔ ڈر کا یہ مفہوم نہیں ہے۔ قرآن میں تو کہا گیا ہے کہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَ لَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:112) قرآن تو مومنین کی بنیادی صفت بتاتا ہے کہ انہیں کوئی خوف نہیں ہے‘ ڈر نہیں ہے‘ حزن تک نہیں ہے‘ دل کی افسردگی اور کبیدگی بھی نہیں ہے۔ حزن بھی نہیں ہے چہ جائیکہ خوف ہو‘ تو وہ تو یہ بتاتا ہے اور اس کے بعد ہم ہیں کہ قدم قدم کے اوپر ڈرو‘ ڈرو اور ڈرو کہتے چلے جاتے ہیں۔ یاد رکھیے! Psychologically (نفسیاتی طور پہ) انسان کے اندر جو سب سے زیادہ Complexes (الجھنیں) پیدا ہوتے ہیں‘ پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں وہ خوف سے پیدا ہوتی ہیں اور اسی لیے میں بار بار کہا کرتا ہوں کہ بچوں کو کبھی نہ ڈراؤ۔ یہ جس کا ہم ڈر ترجمہ کر لیتے ہیں‘ ڈر نہیں ہے۔ یہ کچھ اور ہے۔

قرآنِ حکیم کو سمجھنے کا طریق نیز خشیت کا مفہوم

اب یہاں یہی لفظ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ (36:11) آیا ہے‘ عزیزانِ من! ایک بات عرض کر دوں زندگی کا کچھ پتہ نہیں‘ کچھ بھروسہ نہیں‘ درس تو آپ سنتے ہیں‘ درس میں آپ دیکھتے ہیں کہ میرا بنیادی اصول یہ ہے کہ میں ایک ایک لفظ جو قرآن کا ہے‘ پہلے اس کے معنی متعین کرتا ہوں‘ متعین ہی نہیں کرتا بلکہ عربی زبان میں نزولِ قرآن کے وقت جو اس کے معنی تھے‘ وہ آپ کے سامنے لاتا ہوں‘ پھر اُس سے آگے مفہوم مرتب ہوتا ہے۔ میرے بعد بھی اگر آپ احباب نے قرآن سمجھنا ہو تو میں نے جو طریقہ اختیار کیا تھا‘ اُسے اختیار کیجیے گا‘ فائدہ مند رہے گا۔ قرآن سامنے رکھیے‘ مفہوم القرآن رکھیے‘ لغات القرآن رکھیے‘ یہ جتنے قرآن کے لفظ آئیں جو پہلے نہیں آ چکے‘ پہلے لغت سے ان کا مفہوم‘ ان کے معنی دیکھیے کہ کیا ہیں‘ بنیادی معنی اس کے دیکھیے‘ پھر اُس آیت کا مفہوم میرے مفہوم القرآن میں دیکھیے کہ اُس مفہوم کو میں نے اس آیت کے اندر کس طرح سے فٹ اِن کیا ہے۔ یہ کرتے چلے جایئے تو آپ دیکھیں گے کہ قرآن سمجھنے میں زیادہ دقت نہیں ہوگی۔ غور و فکر تو آپ کو خود کرنا ہوگا‘ وہ تو ہر فرد کا فریضہ ہے لیکن اس سے قرآن سمجھنے کا راستہ آسان ہو جائے گا۔

یہاں کہا ہے کہ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ (36:11)۔ خشیت کیا چیز ہوتی ہے جس کا ترجمہ ڈر ہے؟ اس نے فصل بو رکھی ہے‘ پانی نہیں دے رہا‘ اُس نے خشک ہو جانا ہے۔ وہ فصل اُسی دن خشک نہیں ہوتی‘ کچھ وقت لگتا ہے۔ یہ جو کسی پودے کو پانی نہ دینے سے آخر الامر اُس نے خشک ہو جانا ہے‘ یہ جو احساس ہے کہ اگر میں نے پانی نہ دیا تو یہ فصل خشک ہو جائے گی‘ اسے عربی زبان میں خشیت کہتے ہیں۔

کسی عمل کے نتیجے کے متعلق احساس ہونا ہی اصل شے ہے

اب آپ سوچیے کہ ڈرنے میں اور اس معنی میں کتنا فرق ہے! یہ اس کسان کا احساس ہے کہ اگر وقت پہ پانی نہ دیا گیا تو یہ جو میری کھیتی ہے' یہ خشک ہو جائے گی اور پھر اُس میں دانے نہیں پڑیں گے' فصل نہیں ہوگی' پودے میں پھل نہیں آئے گا' یہ جو اس نقصان کا احساس ہے جو اس کے خشک ہو جانے سے ہوگا' اس احساس کو ''خشیت'' کہتے ہیں۔ کاشتکار کی فصل کو پانی نہ ملنے کی وجہ سے وہ جو فصل خشک ہو جائے گی اُس سے جو اس کو نقصان ہوگا' وہ اس وقت نقصان نہیں ہو رہا' ابھی کچھ نہیں ہو رہا لیکن اُسے اس کا احساس ہے کہ اگر یہ اس طرح سے خشک ہوگئی تو مجھے یہ نقصان ہوگا۔ یہ جو اس وقت آنے والا احساس ہے' یہ تو ہوگا ایمان بالغیب کہ یقیناً ہوگا' اور یہ جو احساس ہے کہ یہ نقصان ہے' اس کو خشیت کہیں گے۔ کہا ہے کہ اس آبِ حیات سے فائدہ وہی اٹھائے گا' جسے یہ احساس ہو کہ اگر اس پودے کو' اگر اس فصل کو وقت پہ پانی نہ دیا گیا تو یہ فصل خشک ہو جائے گی اور آخر الامر میرا اتنا نقصان ہوگا۔ اے رسول! یہ جو تم ان لوگوں سے کہہ رہے ہو کہ بابا! وقت پر پانی دیا کرو' اس سے وہی فائدہ اٹھائے گا جو اس کا احساس کرے کہ اگر پانی نہ دیا تو کیا ہوگا۔ اب بات سمجھ میں آ گئی کہ اس ڈرنے میں اور اس میں فرق کتنا ہے۔ ڈرنے کا تو خارجی علاج ہوسکتا ہے۔ اس کا علاج تو پانی دینے سے ہی ہوگا' چوکیدار بٹھانے سے نہیں ہوگا۔ کہا ہے کہ یہ ہے اصل چیز اور جو ایسا کرے اور پانی دینا شروع کرے' اُسے کہو کہ **فَبَشِّرْهُ بِمَغْفِرَةٍ وَّ اَجْرٍ كَرِيْم (36:11)** جو ایسا کرے تمہاری کھیتی محفوظ بھی رہے گی اور پھر ایسا معاوضہ تمہیں دے گی۔ وہ تو اس قسم کے معاوضوں کو اجر کریم کہتا ہے۔

اجر کریم کا قرآنی مفہوم اور رزق حلال اور رزق حرام میں فرق کی نوعیت

ابھی میں عرض کرونگا کہ یہ کریم کیا بات ہے۔ قرآن نے باعزت رزق کو **رزق کریم** کہا ہے۔ جہاں بھی یہ چیز کہی ہے وہ ہے جسے ہم رزق حلال کہتے ہیں اور قرآن اسے رزق کریم کہتے ہیں: باعزت روٹی۔ روٹی تو ملتی ہے مگر ایک روٹی وہ ہوتی ہے جو شرف اور عزت بیچ کر لی جاتی ہے' قرآن کی رو سے وہی رزقِ حرام ہوتا ہے۔ رزق حلال کی جگہ وہ رزقِ کریم کہتا ہے' جس روٹی میں عزت بھی باقی رہتی ہے شرف بھی باقی رہتا ہے' وہ رزقِ حلال ہے' اجر کریم ہے۔ اور اب آ گئی وہ بات جسے میں شروع میں کہا کرتا ہوں کہ **اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى (36:12)**۔ یہ وہی بات ہے جو میں نے کہا ہے کہ یہ تو ساری سورۃ اس سے بھری پڑی ہے کہ ''آؤ! تمہیں ہم بتائیں'' جہاں سے بات شروع کرو گے وہ مردہ قوم ہوگی۔ وہ قوم پہلے ہی اگر زندگیوں سے بھرپور ہے' تو وہ قوم تو آگے بڑھنے والی ہے' ہم تو اس قوم کا ذکر کر رہے ہیں جو مردہ ہے' جس پہ موت طاری ہے۔

سورۃ یٰسٓ میں دیا گیا پروگرام تو مردے کو زندگی عطا کرنے والا ہے

ہم جو پروگرام تمہیں دے رہے ہیں اس میں نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى (36:12) مُردوں کو زندہ کرنے کا سبق ہے۔ آپ نے غور فرمایا' جو میں نے کہا تھا کہ سورۃ یٰسٓ پیامبرِ حیات ہے۔ پچھلے درس میں پورا موضوع ہی یہی تھا کہ قرآن کی رو سے موت کسے کہتے ہیں' حیات کسے کہتے ہیں؟ یہ حیات سانس کی آمد و شد نہیں ہے۔ ٹھیک ہے یہ Clinically (تشخیصی طور پر) Physically (طبعی طور پر) ڈاکٹر کے سرٹیفکیٹ کی رو سے تو اسی کو زندگی کہتے ہیں لیکن یہ زندگی تو انسان میں بھی ہے' گدھے میں بھی ہے' حیوان میں بھی ہے' یہ تو دونوں میں برابر ہے' اسی کا نام اگر زندگی ہے' تو ٹھیک ہے' حیوانی سطح کی زندگی ہے' قرآن تو اس کو انسان کی زندگی نہیں کہتا' یہ طبعی زندگی تو ہے۔ جسے وہ موت کہتا ہے وہ سانس کے بند ہونے والی بات نہیں ہے۔

اقبالؒ کے نزدیک زندگی کا قرآنی مفہوم

پھر ہمارے سامنے اقبالؒ آ گیا۔ وہ ان چیزوں پر جیسا میں نے عرض کیا ہے' کس طرح سے' کس انداز سے بات کر جاتا ہے! کہتا ہے کہ

کھول کے کیا بیاں کروں سرِ مقامِ مرگ و عشق

وہ جو باشرف حیات ہے اقبالؒ اس کو عشق سے تعبیر کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ

کھول کے کیا بیاں کروں سرِ مقامِ مرگ و عشق
عشق ہے مرگِ باشرف' مرگِ حیات بے شرف

(اقبالؒ: بال جبریل)

'عشق ہے مرگِ باشرف'۔ شرف اور عزت و تکریم کی جو موت ہے وہ ہے زندگی اور 'مرگِ حیات بے شرف' یہ حیاتِ بے شرف موت ہے۔ انسانیت کی بنیادی چیز' عزیزانِ من! تکریمِ آدمیت ہے۔ کہا ہے کہ وَ لَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) ہم نے ہر بنی آدم کو واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ بنی آدم کی آدمی ہونے کی جہت سے یہ بنیادی خصوصیت ہے' یہ اعمال کی رو سے مدارج تو آگے آئیں گے ہر فردِ انسانیت' ہر بنی آدم' ہر آدمی' صرف آدمی ہونے کی جہت سے' انسان کا بچہ ہونے کی جہت سے' واجب التکریم ہے۔ یہی شرفِ انسانیت کہلاتا ہے۔

انسانی زندگی کا بدترین عذاب اس قوم کے لیے ہے جس میں احترامِ آدمیت باقی نہیں رہتا

قرآنِ کریم نے اس کے مقابلے میں جو شدید ترین عذاب کہا ہے' وہ خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا (2:85) دنیا کی ذلت کی زندگی بدترین عذاب ہے' اسے عذابِ مُھین بھی کہا ہے کہ جس میں شرف باقی نہ رہے۔ تو جسے قرآن زندگی کہہ کر پکارتا ہے یا کہتا ہے کہ ہم مُردوں کو زندہ کریں گے تو مردہ' وہ افراد' وہ معاشرہ' وہ قوم ہے جس میں شرف و تکریمِ انسانیت نہیں رہتی۔ اور وہ کرتا یہ ہے کہ اُس معاشرے' اُس نظام کے اندر وہ تغیر پیدا کرتا ہے کہ ہر فرد کو تکریم اور شرف حاصل ہو جاتا ہے۔ اگر کسی معاشرے میں کسی ایک فرد کی بھی تذلیل ہوتی ہے تو وہ اسلامی نہیں کہلا سکتا۔ یہ ہے جسے بنیادی حقوقِ انسانیت (Fundamental Human Rights) کہتے ہیں' جس کے اتنے اتنے بڑے چارٹر بن رہے ہیں اور UNO بھی انہیں شائع کر رہی ہے۔ اس کی تفصیل تو قرآن کریم نے اپنے اپنے مقام پہ دی ہے' بنیاد وہ یہاں کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ سے ہے' ہر انسان انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے' یہ اس کا بنیادی حق ہے انسان ہونے کی جہت سے۔ اگر کہتا ہے کہ اُسے یہ حق نہیں دیا جاتا تو آپ اُس سے حقِ انسانیت چھین رہے ہیں' اسے قرآن نے اس کی تذلیلِ انسانیت کہا ہے' یہ سنگین ترین جرم ہے' یہ عذاب ہے۔

ہمارے ہاں کامیاب زندگی ''عزت'' کی نوکری اور کھانے پینے کی اسودہ حالی کو تصور کیا جاتا ہے

یہ جو زندگی میں کھانا پینا' افزائشِ نسل کرنا اور مر جانا ہے' ہمارے ہاں تو اسی کا نام یہ کامیاب زندگی ہے: جی! اللہ کا بڑا شکر رہتا ہے' بڑی اچھی زندگی گزاری' کامیاب زندگی رہی' جیسے میں کہا کرتا ہوں' نوکری کی' بڑی عزت کی' نوکری کی' پنشن ملی' گھر آ گئے' بال بچوں کی پرورش کی' اللہ کا شکر ہے' بچے اپنی اپنی جگہ نوکر ہو گئے ہیں' وہ بھی سب خوش ہیں' کھانے کو مل رہا ہے' آرام ہے' گھر بھی ہے' ٹھیک ہے آخری وقت ہے' عاقبت کی بھی کچھ فکر ہونی چاہیے' اب میں اپنا وقت اللہ اللہ میں گزارتا ہوں' بڑی اچھی زندگی ہے' اللہ اس قسم کی زندگی ہر کو نصیب کرے اور اس کے بعد مر جانا ہے۔ اکبر الہ آبادی (1846-1921) کہہ رہا ہے:

کیا کہوں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے

بی اے کیا' نوکر ہوئے' پنشن ملی اور مر گئے

اس کارِ نمایاں پہ تو ہم ہنسے ہیں۔ کیا ہر ایک کو اپنا کارِ نمایاں یہی نہیں بتاتے کہ اللہ کا شکر ہے بڑی اچھی زندگی ہے' بڑا احسان ہے اس کا۔ آؤ جس نے زندگی اور موت کے معیار مقرر کیے ہیں' اُس سے پوچھیں کہ یہ زندگی کیا ہے جسے اتنے فخر سے بیان کیا جاتا ہے۔ کھول کے بات کہی تو شاید آپ برداشت ہی نہ کر سکیں لیکن کہنی تو پڑتی ہے۔ کہا ہے کہ وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْکُلُوْنَ

كَمَا تَأْكُلُ الْأَنْعَامُ (47:12) ایک زندگی یہ ہے کہ کھایا پیا' زندگی کے سامان سے فائدہ اٹھایا' اور مر گئے۔ یہی ہے جو میں نے ابھی عرض کیا ہے' الفاظ موجود ہیں' کہیں سے اس کا ترجمہ دیکھ لیجیے گا' وہ یہی ہے۔ یہ ہے ایک زندگی۔ ٹھیک ہے جی! زندگی تو ہے۔

قرآنِ حکیم اس حیوانی زندگی کو کفر قرار دیتا ہے

پہلی چیز تو یہ ہے کہ یہ زندگی کن لوگوں کی ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اگر یہ چیز یہیں کھول کر بیان کی جائے تو ہم برداشت ہی نہ کریں لیکن نہیں! ہم تو اس کے عادی ہو گئے ہیں۔ اسی تے ٹھٹھیاراں تے کبوتر ہو چکے ہوئے ہیگے آں' اینا ں دھڑ کیاں نال ساڈا کچھ نہیں وگڑدا''۔ وہ کہتا ہے کہ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا (47:12) یہ کفار کی زندگی ہے' او بابا! ناراض تو نہ ہو' میں تو نہیں کہہ رہا۔ یہ کفر کی زندگی ہے اس لیے کہ یہ انسانی سطح کی زندگی نہیں' حیوانی سطح کی زندگی ہے' ہر حیوان کی زندگی یہی ہوتی ہے۔ وہ حیوانی سطح کی زندگی کو کفر کی زندگی کہتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (47:12) جہنم ہے۔ جس زندگی کو ہم فخر سے کامیاب زندگی قرار دیتے ہیں اس زندگی کو وہ کفر کی زندگی کہتا ہے' اس کا مآل جہنم بتاتا ہے اس لیے کہ اس ساری زندگی میں جسم کی پرورش ہے' جو حیوان اور انسان میں قدرِ مشترک ہے۔ حیوان کا بھی جسم ہوتا ہے' اُس کی پرورش ہوتی ہے۔ وہ جو شرف ہے' وہ حیوان کا نہیں ہوتا وہ انسان کی زندگی کا ہوتا ہے۔ اس سارے پروگرام میں شرفِ انسانیت کا ذکر نہیں آ رہا' طبعی زندگی کی نشوونما کا اور پرورش کا ذکر آ رہا ہے۔ کہا ہے کہ اگر مقصود یہی ہے تو ٹھیک ہے' یہ کفر کی زندگی ہے اور اس کا مآل جہنم ہے جو اس وقت ساری دنیا کے اندر آگ بھڑک رہی ہے جنہوں نے یہی مقصودِ حیات رکھا' ٹھیک ہے۔ مثالیں دیئے جاتے ہیں کہ جی! فلاں سٹیٹ جو ہے' اُس کو دیکھیے' ویلفیئر سٹیٹ ہے' وہاں افراد کے کھانے پینے کو ملتا ہے' کوئی بھوکا نہیں ہوتا۔ ٹھیک ہے' یہ بڑی ضروری چیز ہے لیکن ان سے یہ بھی پوچھو کہ سب سے زیادہ خودکشی کا ریٹ ان قوموں کے اندر اور ان مملکتوں کے اندر ہے۔ وہ بھی جہنم کے اندر ہیں اس لیے کہ وہ جو حیوانیت سے سطح اونچی ہونی تھی وہ تو وہاں بھی اونچی نہیں ہوئی ہے۔ یہ جو ہے جسے میں نے شرفِ انسانیت کہا ہے' یہ ان چیزوں کو Values یا اقدار کہتے ہیں یعنی کوئی قیمت کی چیز۔ یہ وہ اقدار ہیں جن سے شرفِ انسانیت حاصل ہوتا ہے۔ حیوانات میں اقدار نہیں ہوتیں۔ بیل بھوکا باہر نکلتا ہے جو کھیت سامنے آتا ہے اُس سے وہ چارہ چر لیتا ہے' اُسے اپنی بھوک مٹانی ہے' کفر کی زندگی ہے بیل کی زندگی' کہ جہاں سے کھانے کو ملے' کھائے۔ یہ بات کہ اپنے مالک کے کھیت سے کھانا ہے' غیر کے کھیت سے نہیں کھانا' یہ انسانیت کی سطح ہے۔ اسے کہتے ہیں Value (قدر)' جائز اور ناجائز کی تمیز' حلال اور حرام کا فرق۔ اور اس میں معیار ہے کہ جس کھیل سے' جس کام سے' شرفِ انسانیت کی تحقیر ہوتی ہو' وہ حرام ناجائز کفر ہے اور جس سے اس کی تعمیر ہوتی ہو وہ جائز حلال اور اسلامی ہے۔

کفر اور ایمان کا فرق حیوانی سطح کی بجائے انسانی سطح کو پیش نظر رکھنے سے ہوتا ہے

کفر کی زندگی کا اور ایمان کی زندگی کا فرق تو انسانیت کی سطح کے اوپر ہوتا ہے' حیوان کی سطح پہ تو نہیں ہوتا اور یہ جو زندگی کا منتہا یا مقصد' کھایا پیا' افزائشِ نسل کی اور مر گئے' تو یہ حیوان کا ہے' اسی لیے اسے قرآن کفر کی زندگی کہتا ہے' اس کا مآل جہنم بتاتا ہے کیونکہ اس میں Values یا اقدار کا ذکر نہیں آتا۔ یہ انسانیت کی زندگی ہے۔ قرآن جو کہتا ہے کہ مُردہ قوم کو ہم زندہ کرتے ہیں تو اس کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ جن اقوام نے اپنا زیست کا مقصود ہی یہ رکھا ہے' جسے ہم کفر کی زندگی کہہ رہے ہیں' جس میں شرفِ انسانیت اور تکریمِ آدمیت کا ذکر نہیں آتا' یہ موت ہے' حقیقت میں انسانیت کی زندگی نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہم اس سطح کے اوپر جینے والے انسانوں کو' اُس سطح پہ لے کر جائیں گے جہاں شرفِ انسانیت قائم ہو جائے گی۔ اسی کا نام اسلام ہے' عزیزانِ من! اب یہ چیز جو ہے کھانے پینے کی بھی' اول تو یہ سطح ہی کفر کی زندگی ہے اور اگر صورت یہ ہو کہ کھانے پینے کو بھی نہ ملے تو پوچھو ہی نہیں کہ اس کا نام کیا رکھا جائے یعنی صرف کھانے پینے کی زندگی جو ہے اُس کو تو اس نے کفر کی زندگی قرار دیدیا تو معیار اور مقصود یا منتہا تو رکھا جائے صرف کھانے پینے کی زندگی اور اس میں وہ بھی نہ ملے' اب اس کے لیے مجھے تو کوئی لفظ ہی سجھائی نہیں دیتا کہ میں عرض کروں کہ یہ کیا زندگی ہے اس کے لیے۔ لیکن قرآن اس کا ذکر کرتا ہے۔ کفر کی زندگی میں بھی ایک عذاب کی زندگی ہے۔

ہر روز طلوع ہونے والا سورج فکرِ قرآنی کی محکمیت اور حاکمیت کی نوید لیے ہوئے ہوتا ہے

عزیزانِ من! میں نے جیسا عرض کیا ہے' جوں جوں انسان فکری طور پر' غور و تدبر سے' کائنات کے اوپر فکر سے' سوچ سے' سمجھ سے' کائنات کے رموز اور حقائق کو بے نقاب کرتا چلا جاتا ہے' قرآن کی کوئی نہ کوئی حقیقت ہے جس کی وہ چیز شہادت اور اُس کی صداقت کی گواہی بنتی چلی جاتی ہے۔ دو ایک مقامات تھے ان پہ میں بہت عرصہ غور کرتا رہا' پورے طور پہ بات سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ آج کل سائیکولوجی کا بڑا زور ہے۔ اگلے ہی دن American Psychologist (امریکی ماہر نفسیات) کی ایک چیز میرے سامنے آئی اور قرآن کی آیت کے معنی یوں نکھر کر ہمارے سامنے آ گئے۔ اُس نے کہا یہ ہے کہ یہ انسانی تقاضا ہے یعنی یہی طبعی زندگی کے تقاضے' جہاں سے وہ لوگ شروع کرتے ہیں' اُس نے کہا کہ پہلا جو Basic (بنیادی) تقاضا ہے' وہ رزق کا تقاضا ہے یعنی وہ چیزیں ہیں جن سے انسان کی زندگی قائم رہتی ہو۔ یہ روٹی کا تقاضا ہے کہ پہلا تقاضا انسان کا یہ ہوتا ہے اور یہ بڑا شدید ہوتا ہے۔ اس کی تحقیق یہ ہے کہ اگر انسان اسی تقاضے میں الجھا ہوا رہے تو اس سے بلند سطح کی جو کوئی چیز ہے' اس کے لیے اُس کو سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملتی' اُس کی توجہ اس طرف جاتی ہی نہیں' وہ اسی الجھن میں رہتا ہے۔ وہ سائیکولوجیکلی (نفسیاتی طور پر) اتنا Basic

(بنیادی) تقاضا ہے۔ اُس نے یہ بات کہی تو مجھے وہ سعدیؒ (1184-1291) یاد آ گیا کہ ہمارے پرانے زمانے میں یہ بھی پہنچے ہوئے تھے۔ سعدیؒ کا انداز بڑا عجیب تھا:

چناں قحط سالے شد اندر دمشق

ایک دفعہ دمشق میں ایسا قحط پڑا کہ

کہ یاراں فراموش کردند عشق

آدمی عشق نہیں بھولتا۔ کہا ہے کہ کمبخت روٹی کا مسئلہ اتنا سخت ہوتا ہے کہ جب وہ قحط پڑا تو قحط کی شدت کا اندازہ لگایئے' کس انداز سے یہ شخص کہہ گیا ہے' کہ اور تو اور لوگوں نے عشق کرنا ہی بھلا دیا۔

انسان کے لیے اس کرہ ارض پر سنگین ترین مسئلہ روٹی کا اور تحفظ کا مسئلہ ہے

آج' عزیزانِ من! ہزار سال بعد اس کا سائیکولوجسٹ یہ کہتا ہے کہ یہ روٹی کا تقاضا ایک ایسا تقاضا ہے کہ اس کی Satisfaction (تسکین) نہ ہو تو انسان اس سے بلند کوئی چیز سوچ ہی نہیں سکتا۔ وہ Extreme (انتہا) کی بات سعدیؒ (1184-1291) نے کہی ہے جو انسان کسی حالت میں بھی بھلا نہیں سکتا لیکن روٹی کے تقاضے کی جو شدت ہے وہ ایسی ہے اُسے بھی بھلاتا ہے' اور یہ سائیکولوجسٹ کہتے ہیں کہ اُس زمانے میں آدمی کچھ اور سوچ ہی نہیں سکتا۔ اگلی بات اُس نے یہ کہی ہے کہ جب روٹی کی طرف سے وہ مطمئن ہوتا ہے تو اگلا تقاضا اس کو تحفظ کا' سکیورٹی کا' ہوتا ہے کہ اس کو حفاظت حاصل ہونی چاہیے۔ اگر اس کو روٹی تو ملی ہے' حفاظت نہیں ہے' پھر بھی اُس کی یہی کیفیت ہوگی۔ وہ کچھ اور نہیں سوچ سکتا' ہر وقت اُسے خوف دامن گیر رہے گا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دو تقاضے پورے ہو جائیں تو جسے تم Values (اقدار) کہتے ہو اس کے متعلق انسان پھر اس قابل ہوتا ہے کہ سوچے کہ Value (قدر) کیا ہوتی ہے۔ عجیب لوگ ہیں یہ! اُس نے کہا ہے کہ تم وعظ اور نصیحتیں کرتے رہتے ہو کہ صاحب! انسانوں کو جرائم پیشہ نہیں ہونا چاہیے' قانون کا احترام کرنا چاہیے' اخلاقِ حسنہ ہونے چاہئیں' سیرت و کردار بلند ہونی چاہیے' ان سے کچھ نہیں ہوتا۔ اُس نے کہا ہے کہ جو جی میں آئے کرتے رہو' جس شخص کو ان دو تقاضوں یعنی روٹی اور حفاظت کی طرف سے یقینِ کامل نہیں ہوگا' وہ اقدار کے متعلق یا Values کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔

قرآنِ حکیم نے چودہ سو سال پیشتر روٹی کے اس مسئلہ کی اہمیت کو پیش کر دیا تھا

جب اُس امریکی ماہرِ نفسیات نے یہ کہا تو قرآن کی دونوں آیتیں جو میرے سامنے ہیں' نکھر کر سامنے آ گئیں۔ قرآن مثال

دے کر بات سمجھا رہا ہے کہ وَ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا قَرْيَةً كَانَتْ اٰمِنَةً مُّطْمَئِنَّةً يَّاْتِيْهَا رِزْقُهَا رَغَدًا مِّنْ كُلِّ مَكَانٍ (16:112) مثال کے طور پہ کہتا ہے کہ خدا اس بات کو سمجھاتا ہے کہ ایک تھی بستی' ایک تھی قوم' نہایت امن میں تھی' اطمینان میں تھی' روٹی کی طرف سے اطمینان تھا' خوف کے مقابل سکیورٹی' امن تھا یہ دونوں چیزیں حاصل تھیں' ہر طرف سے فراواں رزق بھی ملتا تھا مگر فَكَفَرَتْ بِاَنْعُمِ اللّٰهِ (16:112) خدا کی ان نعمتوں سے اُنہوں نے کفران برتا' وہ جو بناوٹ کی زندگی بسر کرتے تھے' اور اُنہوں نے خدا کی' کفرانِ نعمت کی جو کچھ ان کو دیا تھا انہوں نے اس پر پردے ڈال کے رکھا' ڈھانپ کے رکھا' اسے نوعِ انسانی کے لیے عام نہیں کیا' تو کیا ہوا؟ کہا کہ فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَ الْخَوْفِ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ (16:112) اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ خوف اور بھوک کے عذاب میں مبتلا ہو گئے' اس سے اونچی سوچ ہی اس قوم کی ختم ہو گئی۔ یہ چیز جو تھی کئی دفعہ میں نے عرض کیا ہے کہ میں تو قرآن کے ایک مقام پہ کھڑا ہو جاتا ہوں' سوچتا رہا کہ قرآن نے چُن کر یہ دو چیزیں کیوں کہی ہیں اور بھی عذاب کی تو بہت سی بڑی شکلیں ہوتی ہیں' یہ خاص طور پہ جو دو شکلیں تھیں وہ کیوں کہیں؟ آج سائیکولوجسٹ کہتا ہے کہ بنیادی تقاضے ہی دو ہیں' اگر ان میں اطمینان حاصل نہیں ہوتا تو اگلی بات ہی نہیں ہوتی۔ اور اس سے بات آگے آئی' جہاں سمجھ میں آئی' کہا ہے کہ لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ (106:1) قریش کے متعلق یہ کہا' یہاں وہ بات آئی کہ ان دو بنیادی تقاضوں کی طرف سے اطمینان حاصل ہو جائے تو پھر جسے آپ اقدار کہتے ہیں' Values کہتے ہیں' اس کے سوچنے کے یا اُس پہ عمل کرنے کے قابل انسان اُس وقت ہوتا۔ کس حسین انداز میں قرآن نے یہ بات کہی کہ قریش کو اتنی نعمتیں ہم نے دیں' ان کے کارواں درکارواں گرمی میں' سردی میں' صحراؤں میں' میدانوں میں' پھرتے تھے۔ عربوں کے ہاں کسی کا کوئی قافلہ محفوظ ہی نہیں رہا کرتا تھا۔ کہا کہ ان کو ہم نے وہ قیادت اور امامت دی ہے کہ ان کے قافلوں کی طرف کوئی بری نگاہ سے دیکھتا ہی نہیں۔ یہ کتنا بڑا اطمینان ہے! کہا کہ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ. الَّذِيْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ (106:3.4) جب خدا نے انہیں بھوک کی طرف سے مطمئن کر دیا' کوئی خوف نہیں رہا ہے' اُس کی طرف سے سکیورٹی حاصل ہو گئی' تو اب کونسی چیز مانع ہے کہ یہ خدا کی اقدار کی طرف نہ آئیں۔ وہ جو جوع اور خوف کے' بھوک اور سکیورٹی کے دونوں تقاضے ہیں یہاں وہ گنایا ہے کہ جب یہ پورے ہو گئے ہیں تو اب کونسی چیز باقی ہے کہ فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ. الَّذِيْٓ (106:3.4) اب عبودیتِ خداوندی کی طرف یہ کیوں نہیں آتے۔ عبودیتِ خداوندی کے تو معنی ہیں اقدارِ خداوندی کا اتباع۔ تو گویا اُس نے وہاں خوف اور بھوک کو عذاب قرار دیا ہے کہ جو قومیں اسی کے اندر الجھ جائیں وہ تو آگے چل ہی نہیں سکتیں۔ وہ مل جائے' اور نصب العینِ زندگی یا مقصودِ حیات وہی ہو کہ کھایا پیا' افزائشِ نسل کی' مر گئے' تو یہ کفر کی زندگی ہے لیکن کم از کم اُس نے کہا ہے کہ حیوان کی زندگی سہی' کالانعام' لیکن بہر حال ان چیزوں سے اطمینان تو ہے۔

قرآنِ حکیم کا پہلا لفظ ''رب'' روٹی کے تقاضوں کی اہمیت کو جاننے کے لیے کافی ہے

آگے جو زندگی ہے جس میں فَلْيَعْبُدُوْا والی بات آئی ہے' اقدارِ خداوندی کا اتباع کرنا ہے' اُس میں کہا ہے کہ پہلے یہ دو تقاضے پورے ہونگے تو پھر انسان اس قابل ہوگا کہ ان کے متعلق کچھ سوچے۔ اس لیے قریش کو پہلے یہ کہا کہ ہم نے یہ دو چیزیں پوری کر دی ہیں تمہارے لیے' اب کونسی چیز باقی ہے جو تم ادھر نہیں آتے۔ اب آ گئے ہم' عزیزانِ من! کہا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى (36:12) ہم مُردہ قوموں کو زندگی عطا کرتے ہیں۔ کیا عطا کرتے ہیں؟ رزق اور تحفظ کی طرف سے کامل اطمینان۔ یہ پہلی چیز ہے۔ اس اطمینان کے بعد مقصودِ حیات وہ کفر کا نہیں کہ Animal Level (حیوانی سطح) کی زندگی ہے' صرف کھانے پینے کی یعنی کھانے پینے کی اہمیت کو کم نہیں کیا' Basically (بنیادی طور پر) کہا کہ پہلے بنیادی چیز یہ ہے' بنیادی تقاضا یہ ہے۔

خاک کے ان پردوں میں چھپی ہوئی انسانی ذات کی قدر و منزلت اور اس کی نشو و نما کے تقاضوں کے پیشِ نظر احترامِ آدمیت کی تاکید

یہ تو بنیاد ہے۔ بنیاد کو عمارت تو نہیں کہتے۔ صرف بنیاد کے تلے بیٹھ کر نہ آپ گرمی سے محفوظ رہ سکتے ہیں' نہ بارش سے' نہ چور سے' نہ ڈکیتی سے۔ اُس کے اوپر تو عمارت بنانی ہوتی ہے۔ یہ بنیاد ہے۔ اُس کے اوپر کہا ہے کہ یہ حاصل ہونے کے بعد اب انسانوں کی کیفیت ہوگی کہ یا تو کفر کی زندگی ہوگی کہ مقصودِ حیات ہی اتنا اور مطمئن ہیں کہ اللہ کا شکر ہے' بڑی اچھی زندگی ہے۔ اور ایمان کی زندگی اور مومن کی زندگی یہ ہے کہ پھر اقدارِ خداوندی سامنے ہوں۔ جب یہ آئے گا تو پھر مُردہ زندہ ہوگا' پھر اس قوم کو ہم زندہ قوموں میں شمار کریں گے۔ زندگی جسے اُس نے ایمان کا ثمر قرار دیا ہے' اُس میں ہوتا کیا ہے؟ یہ کہ شرفِ انسانیت قائم رہتا ہے' حیاتِ بے شرف مرگ ہے' مرگِ باشرف زندگی ہے'۔ سن رکھیے' عزیزانِ من! اگر یہ چاہتے ہیں کہ معلوم ہو کہ سب سے بڑا ثواب کا کام' نیکی کا کام' انسانیت کا' ایمان کا' کام کیا ہے تو یاد رکھیے! انسان کی تکریم اور تعظیم سب سے بڑی نیکی کا کام ہے۔ میزانِ خداوندی میں سب سے بڑا جرم کسی انسان کی توہین اور تذلیل ہے' خواہ وہ آپ کی نگاہوں سے ہی کیوں نہ ہو۔ یہ بنیاد ہے' جسے قرآن کہتا ہے کہ ہم نے انسان کو یہ چیز دی اور تم اُس سے چھینتے ہو' یہ خدا کے خلاف اعلانِ جنگ ہے' یہ توہینِ انسانیت ہے' اصلِ تہذیب احترامِ آدم است' میں پھر عرض کر دوں کہ قرآن نے موت کے بعد حیات کا جو پروگرام دیا ہے اس کے لیے پچھلی دفعہ یہ آیت آئی تھی' اس دفعہ پھر اُسے دہرا دیتا ہوں کیونکہ اسی سے سلسلۂ کلام آگے چلے گا۔ کہا ہے کہ اَوَ مَنْ كَانَ مَيْتًا (6:122) سوچو اے وہ قوم! جو مردہ تھی۔ تم موازنہ کرو کہ ایک شخص مردہ ہو۔ تو اب ہماری سمجھ میں بات آ گئی کہ جب وہ مردہ کہتا ہے تو اس کے کیا معنی ہیں؟ یا تو بنیادی طور پر

روٹی اور خوف سے اطمینان کی کوئی بھی حالت نہیں تھی' وہ چیز بھی میسر نہیں تھی۔ پہلی چیز تو یہ ہوگئی۔ اگر یہ میسر تھی تو اُس نے مقصدِ زندگی' منتہائے حیات Animal Life (حیوانی سطح) کی زندگی کو قرار دیا تھا۔ اس زندگی کا نام صرف کھانا پینا ہے۔ یہ کفر ہے۔ لیکن اگر زندگی کا منتہا اُس سے اونچا ہے تو اسی لیے قرآن نے کفر اور ایمان کا امتیاز یہاں سے شروع کیا ہے' حیوانات سے تو شروع نہیں کیا۔ اُس نے کبھی نہیں کہا کہ گدھا کافر ہوتا ہے۔ تو کفر اور امتیاز ہوا کہ کھانے پینے کو مل رہا ہے۔ مقصودِ زندگی کیا ہے؟ یہ ہے اصل سوال۔ حیوانی سطح زندگی کفر ہے۔ کہا ہے کہ اَوَ مَنۡ کَانَ مَیۡتًا (6:122) تم اپنی اور ان کی حالت کا موازنہ یوں کرو کہ ایک شخص مردہ ہو۔ اب جو یہاں تک بھی ہے وہ اُس کے نزدیک مردہ ہے فَاَحۡیَیۡنٰہُ (6:122) پہلا پروگرام یہ ہے کہ اس قوم کو اس سطح کے اوپر لاؤ کہ اُسے روٹی اور خوف کی طرف سے اطمینانِ کامل حاصل ہو۔ یہ دو بنیادی تقاضے پورے ہو رہے ہیں۔ پھر اگلی بات یہ ہے کہ یہ جو کھانے پینے کو مل رہا ہے' یہ بیل اور گدھے کی سطح پہ ان کو نہیں دیا جا رہا' حیوانات کی سطح پہ نہیں دیا جا رہا' حیوان اپنے مالک یا چرواہے کے کسی مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں' مالک نے گھوڑے کو جدھر کی سواریاں لادنی ہیں اُدھر کو اشارہ کیا' اگر نہیں جاتا ہے تو پیچھے سے ہنٹر پڑتا ہے۔ شرفِ انسانیت یہ نہیں ہے۔ کوئی انسان جو کسی دوسرے انسان کے لیے Instrument (آلہ کار) بنتا ہے وہ اس کی توہین ہے۔

انسانی سطح زندگی تک پہنچ جانے کے بعد دوسری منزل کا تعارف اور اس کی اہمیت کی وضاحت

یہ کچھ کرنے کے بعد اب اگلی چیز یہ آئی کہ فَلۡیَعۡبُدُوۡا رَبَّ ہٰذَا الۡبَیۡتِ . الَّذِیۡۤ (106:3.4) دنیا میں کسی کی محکومیت نہیں ہے کیونکہ اب احتیاج کسی کا نہیں' محکومیت صرف اقدارِ خداوندی کی ہے' اب انسان کی سطح کے اوپر یہ معاشرہ آیا۔ انسان کی سطح ہی کو ایمان کی سطح کہتے ہیں' جس میں شرفِ انسانیت قائم ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ فَاَحۡیَیۡنٰہُ وَ جَعَلۡنَا لَہٗ نُوۡرًا (6:122) اُس کے ہاتھ میں اب ہم نے ایک قندیل' ایک شمع روشن دی۔ انسانیت کی سطح پہ پہنچا کر قرآن کچھ کام لیتا ہے۔ کہا ہے کہ لِّیُنۡذِرَ مَنۡ کَانَ حَیًّا (37:170) قرآن نے رسول اللہ ﷺ سے کہا ہے کہ قرآن تمہیں دیا جاتا ہے تاکہ جو لوگ انسانیت کی زندہ سطح کے اوپر آ چکے ہیں' انہیں تو صحیح راستے کی طرف راہنمائی کرے۔ انہیں کرے جو مذکورہ دو منزلوں کے نیچے نہیں ہیں یعنی وہ بھوک اور خوف کے عذاب میں مبتلا نہیں ہیں۔ ان کا اب بنیادی تقاضا ہی نہیں ہے' ان کے بنیادی تقاضے پورے ہو رہے ہیں اور جن کا مقصودِ حیات وہ ہے جسے اُس نے کفر کی زندگی کہا ہے' محض Animal Life (حیوانی زندگی) ہے تو وہاں بھی قرآن کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ قرآن فائدہ دیتا ہے جب انسان انسانیت کی سطح پہ آتا ہے کیونکہ اس کا تعلق اقدار سے ہے' Values سے ہے۔

جس کے ہاتھ میں شمع قرآنی ہو اس کا تو فریضہ عالم گیر سطح پر راستوں کو روشن کرنا قرار پاتا ہے

یہاں کہا ہے کہ وَ جَعَلْنَا لَهٗ نُوْرًا (6:122) اُن کے ہاتھ میں ایک شمع دی۔ ٹھیک ہے تو کیا اتنا ہی فریضہ ہے کہ اُس کے ہاتھ میں شمع آ گئی' وہ اُس لالٹین کو لے کر چلے' آگے آگے راستہ صاف ہوتا جائے گا وہ چلتا جائے گا۔ کہا کہ نہیں' فریضہ اس سے آگے ہے۔ اپنا ہی راستہ روشن کرنے کے دعویدار تو بہت ہوتے ہیں' اپنی اپنی نجات کی فکر' اپنی اپنی روحانیت کی فکر تو اس وقت ہوتی ہے جب دین کا تصور بگڑ جائے' پھر انفرادی نجات کا اپنی اپنی نجات کا تصور آ جاتا ہے کہ کسی طرح سے میں بخشا جاؤں۔ تو یہ جو یہاں ''نور'' دیا جا رہا ہے' اس سے اس کا راستہ تو روشن ہوگا ہی لیکن آگے کہا ہے کہ یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ (6:122) جا کر نوعِ انسانی کا راستہ روشن کرو:

یہ شہادت گہ الفت میں قدم رکھنا ہے
لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

تقلید پرستی نے ہمیشہ ماضی کو روشن اور مستقبل کو تاریک کیا ہے

عزیزانِ من! وہ جو شمع بردار ہے اُس کا فریضہ بہت بڑا ہے۔ اور اگر اُس شمع کو لے کر' لالٹین کو لے کر' آپ اندھیری رات میں چلیں اور لالٹین پیچھے رکھیں تو اگلا راستہ پہلے سے بھی زیادہ تاریک ہو جاتا ہے کیونکہ کچھ تو پہلے تاریک ہے اور کچھ تمہارے اپنے سائے سے تاریک ہو جاتا ہے' ماضی (Past) سے آپ کا پچھلا راستہ روشن ہوتا رہے گا مگر مستقبل (Future) تاریک ہوتا رہے گا۔ مذہب میں تقلید پرستی یہ کرتی ہے کہ ماضی بڑا درخشندہ بتایا جاتا ہے اور حال و مستقبل تاریک سے تاریک تر اور اگر کسی کو فکر ہوتی ہے تو انفرادی نجات کی ہوتی ہے مگر جس کے ہاتھ میں شمع قرآنی ہو اس کا فریضہ ہے کہ یَّمْشِیْ بِهٖ فِی النَّاسِ (6:122) خود بھی اس قرآنی روشنی میں چلے اور دوسروں کو بھی صحیح راستے پر چلائے۔ آگے کہا ہے کہ كَمَنْ مَّثَلُهٗ فِی الظُّلُمٰتِ (6:122) کیا یہ قوم جو زندگی کی سطح کے اوپر قندیلِ قرآنی اپنے ہاتھ میں لیے' اپنے راستے بھی روشن' اور انسانیت کی راہوں کو بھی روشن کرتے چلے جانے والے ہیں' یہ ان کے مانند ہو جائیں گے جو تاریکی میں رہتے ہیں اور لَیْسَ بِخَارِجٍ مِّنْهَا (6:122) اور اس تاریکی سے نکلنا ہی نہیں چاہتے۔ وہ چمگادڑ کی نسل ہو گئے ہیں' انہیں تاریکی ہی میں سکون میسر ہوتا ہے' سورج ان کا سب سے بڑا دشمن ہوتا ہے' یہ ان کے تو بس میں ہی نہیں ہوتا اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ سورج کو چڑھنے ہی نہ دیں یہ ان کے بھی بس میں نہیں ہے یہ دونوں کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہا کہ كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ (6:122) یہی حالت ان صداقت سے انکار کرنے

والوں کی ہے اور کچھ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ بڑا ہی کارِنمایاں کر رہے ہیں' بڑا نیکی کا کام کر رہے ہیں' ان کے اعمال ان کی نگاہوں میں مزین ہو جاتے ہیں۔اس لیے وہ وحی خداوندی کے بجائے اپنے خودساختہ معتقدات ورسومات میں خوش رہتے ہیں۔

انسانی معاشرے کی تاریک رات کوطول دینے والے مجرموں کے سرغنوں کی سازشیں

عزیزانِ من! اگلی آیت میں تو پوچھو ہی نہیں کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔کہا ہے کہ وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ اَكٰبِرَ مُجْرِمِيْهَا (6:123) ہر قوم میں' ہر بستی کے اندر' کچھ تو مجرم ہوتے ہیں' کچھ مجرموں کے سرغنہ ہوتے ہیں' یہ لوگ تاریکیوں میں رکھنے والے ہوتے ہیں ان کی نفسیاتی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ لِيَمْكُرُوْا فِيْهَا(6:123) وہ مخالفت کے عجیب عجیب پلان بناتے رہتے ہیں' سازشیں کرتے رہتے ہیں کہ یہ شمع قرآنی کے علمبردار تاریکیوں میں سے نکلنے ہی نہ پائیں' یہ کہیں روشنی میں نہ آجائیں' کہیں یہ قرآن کی شمع ہی نہ آگے رکھ دی جائے لیکن وَ مَا يَمْكُرُوْنَ اِلَّا بِاَنْفُسِهِمْ وَ مَا يَشْعُرُوْنَ (6:123) پلان تو بناتے ہیں' جذباتی طور پر یہ سارا کچھ کرتے ہیں' شعوری طور پر بات سمجھتے نہیں ہیں کہ یہ ہمارے ہی خلاف پڑے گی جو کچھ ہم کر رہے ہیں۔پہلی چیز عزیزانِ من! یہ ہوتی ہے کہ مُردوں کی سطح سے زندوں کی سطح کے اوپر اس قوم کو لانا ہوتا ہے اور اس کا تعلق نگاہ کے زاویئے کو بدلنے' قلب ودماغ کو بدلنے اور تطہیرِ فکر کرنے پر ہوتا ہے۔اس کے لیے کہا جائے گا کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ کتاب وحکمت کی تعلیم ہو۔یہ چیز ہو۔

قوم کی نفسیات کوتبدیل کیے بغیر طرزِ زندگی میں تبدیلی پیدا ہو ہی نہیں سکتی

اب سوال یہ ہے کہ یہ زندگی کہاں سے شروع ہوگی؟ کیا کہہ گیا ہے یہ شخص!

دلِ مردہ دل نہیں ہے' اسے زندہ کر دوبارہ

بات تو ساری اُس پہ ہے جسے ہم دل' ذہنیت' انسان کے تخیلات' نظریات' معتقدات کہتے ہیں

کہ یہی ہے اُمتوں کے مَرضِ کہن کا چارہ

(اقبالؒ: ضربِ کلیم)

آپ قوم میں حیاتِ تازہ پیدا نہیں کر سکتے جب تک کہ افراد کی تطہیرِ فکر نہ کریں اور یہ چیز قرآن کی تعلیم وتربیت سے ہوتی ہے' کہ یہی ہے اُمتوں کے مَرضِ کہن کا چارہ۔کہا ہے کہ اِنَّا نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى (36:12) جب یہ زندگی کی سطح کے اوپر پہنچتے ہیں' تو ہم مردہ قوموں کو حیاتِ نو عطا کر دیتے ہیں تو سوال یہ ہے کہ ان کی نشانیاں کیا ہوتی ہیں؟ اقبالؒ (1938-877) نے کہا ہے کہ

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

(اقبالؒ: ارمغانِ حجاز۔اردو)

وہ تو عجیب معیار دیتا ہے کہ صبح وشام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں۔قرآن یہ آپ کے سامنے رکھتا ہے۔

حال ہو یا مستقبل، قوموں کی عزت واحترام کا ملکہ ان کے چھوڑے ہوئے نقوش پر ہی ثبت ہوتا ہے

کہا ہے کہ وَ نَکْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَھُمْ (36:12)۔ہم لکھتے جاتے ہیں، اُس کے معنی یہ ہوتا ہے کہ ان کا یہ سارا جو عمل ہے، جو ان کا پروگرام ہے، ان کے جو پلان ہیں، وہ سارا کچھ اس قوم کے ہاں ثبت ہوتا جاتا ہے، وہ زمانے کے ریگِ رواں پہ ثبت ہوتا ہے یہ مَا قَدَّمُوْا (36:12) ہوتا ہے کہ اُنہوں نے فیوچر (مستقبل) کے لیے کیا کیا۔ یہ بڑی چیز ہے، یہ زندہ قوموں کی پہچان ہے، یہ معیار ہے۔پہلی چیز تو یہ ہے کہ وہ Future (مستقبل) کے لیے کیا کر رہے ہیں اور دوسری چیز وَاٰثَارَھُمْ (36:12) ہے کہ وہ پیچھے سے آنے والوں کے لیے کس قسم کے نقشِ قدم چھوڑ رہے ہیں یعنی اپنے لیے فیوچر میں کیا کر رہے ہیں اور ان کے بعد جو آنے والے ہیں، ان کے لیے کس قسم کے نقوشِ قدم چھوڑ رہے ہیں۔عزیزانِ من! دو الفاظ ہیں اگر دونوں الفاظ آپ کے ہاں رکھ لیے جائیں تو نظر آجاتا ہے کہ اسلامی مملکت کا Constitution (آئین) کیا کہے گا اور اس کے کیا مقاصد ہونگے۔وہ مقاصد یہ ہیں کہ وَ نَکْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَ اٰثَارَھُمْ (36:12) اور جو کچھ وہ اپنے مستقبل کے لیے کرتی ہیں، اسے بھی ہمارا قانون مکافات اپنے رجسٹر میں درج کیے جاتا ہے، اور جو نقوش وہ آنے والی نسلوں کے لیے چھوڑ جاتے ہیں، وہ بھی محفوظ رہتے ہیں۔عزیزانِ من! بلاشبہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہوسکتا: اتنی جامعیت، اتنا ایجاز، اس قدر اختصار، اور وہ بھی ان دو الفاظ میں سمٹ آیا ہے۔یہ کس جامعیت، ایجاز واختصار کے الفاظ ہیں!

زندگی کی کامیابی کا تمام تر دارومدار تو خیر وشر کے اس معیار پر ہے جو قرآنِ حکیم نے اپنے ہاں مقرر کر رکھا ہے

قوموں کی زندگی اور موت اور ان کے سارے معیار جتنے بھی ہیں خیر اور شر کے دو لفظوں کے اندر سمٹا کر رکھ دیئے ہیں۔کہا ہے کہ نُحْیِ الْمَوْتٰی (36:12) موت کی سطح سے زندگی کی سطح میں، زندگی سطح کے اندر پہچاننے کی یہ بات بتادی کہ فیوچر (مستقبل) کے لیے کیا کچھ کر رہے ہو، آنے والوں کے لیے کیا نقوشِ قدم چھوڑ رہے ہو، کیا اس کا فیصلہ تم پہ چھوڑ دیا گیا کہ جسے تم اچھا سمجھتے ہو،

اُسے تم کرتے جاؤ' وہ اچھا ہوگیا' جسے تم سمجھتے ہو کہ یہ اچھے نقوشِ قدم چھوڑ رہے ہیں وہ اچھے ہوگئے؟ یہ کہا کہ کیا تمہارے اوپر اس کا فیصلہ ہوگا' تم خود فیصلہ کرو گے؟ انسان خود تو فیصلہ کر نہیں سکتا' فیصلہ تو خارج سے ہونا ہے۔ کوئی معیار باہر ہونا چاہیے' کوئی اسٹینڈرڈ جس کے اوپر پرکھ کر دیکھا جائے خارج سے ہونا چاہیے ورنہ ''ہر مائی اپنا سونا' جیہڑا لے کے جائے گی' اوہنوں خالص سونا کہے گی''[1] وہ تو کسوٹی پہ پرکھا جائے گا تو پتہ چلے گا۔ یہ بات مطلق نہیں کہ تم جس کو اچھا سمجھتے ہو' وہی اچھا (Good) ہو۔

سورۃ یٰسٓ میں ''ساتِ مبینیں'' کے تحت قرآن حکیم کی تلاوت کے ذکر کا تصور

کہا ہے کہ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (36:12)۔ اس سورۃ میں یہ امام مبین ہے جسے کہتے ہیں کہ اس میں سات مبینیں آتی ہیں۔ ہمارے ہاں پہلی عورتیں کہا کرتی تھیں کہ ''سورۃ یٰسٓ اچ سات مبیناں اوندیاں نیں[2]''۔ اس اعتبار سے وہ ہمارا عجیب دور تھا کہ صبح آنکھ کھلتی تھی تو گھروں میں قرآن کھلے ہوئے ہوتے تھے۔ ٹھیک ہے ہمارے گھروں میں قرآن کی آواز تو آتی تھی' رزقِ حلال بھی تھا' اماں جی چکی بھی پیستی تھیں' قرآن بھی کھلا تھا۔ یہ جو مبینیں ہیں ان کے متعلق وہ کہا کرتی تھیں سورۃ یٰسٓ کی تلاوت کر کے' پتہ نہیں ہر مبین کے اوپر کچھ پھونک مارتی تھیں یا پانی کا گھونٹ پیتی تھیں' تو سات مبینیں ہوتی تھیں۔ یہاں کہا ہے کہ وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (36:12)۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ ماپنے کا وہ Objective Standard (خارجی معیار) کیا قرار دیتا ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ تو یہ ہے کہ ہر چیز کو ہم محفوظ کر لیتے ہیں ایک کتاب میں' جو بیان واضح کر دیتی ہے۔ یہ محفوظ کر لینا تو وہ ہے جسے آپ اعمالنامہ کہتے ہیں۔ یہ وہ ہے۔ یہ امام کا لفظ' ٹھیک ہے' قرآنِ کریم نے اعمالنامے کے لیے بھی اس اصطلاح کو استعمال کیا ہے۔ اس لیے میں نے کہا ہے کہ قرآن کی ہر بات 'اس لیے' ہوتی ہے۔

انسان کا ہر عمل اس کا امام ہوتا ہے (آگے آگے چلنے والا) نیز آگاہ رکھنے والا اور نگرانی کرنے والا

ابھی ابھی میں نے ''غیب'' کے متعلق کہا تھا کہ اس وقت جو عمل سرزد ہوتا ہے' قرآن کہتا ہے کہ تم اسے آگے بھیج دیتے ہو' جب تم وہاں پہنچو گے تو اس کا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا۔ عمل ہمیشہ انسان کے آگے آگے چلتا ہے۔ اس نے جو کیا ہے وہ آگے گیا ہے' چار قدم پہ نتیجہ آجائے' دس پہ آجائے' آگے چل کر آئے' وہ آگے چلتا ہے۔ امام کے معنی چونکہ آگے چلنے والا ہوتا ہے' اس لیے

---

[1] ہر عورت' جو اپنا سونا (Gold) لے کر جائے گی وہ اسے ہی خالص سونا (Pure Gold) کہے گی۔

[2] سورۃ یٰسٓ میں سات مبینیں آتی ہیں۔

اُس نے اعمالنامہ کے لیے بھی یہ اصطلاح استعمال کی ہے۔ وہ تمہارے اعمال جو آگے گئے' جہاں پہ آئیں' دیکھ لینا کہ نتیجہ کیا نکلتا ہے۔اور آگے میں عرض کرونگا کہ قرآن نے طآئر (17:13) کا لفظ استعمال کیا ہے' وہ پرندہ جو ہاتھ سے نکل گیا۔ واہ واہ واہ! جو عمل سرزد ہو گیا' ہاتھ سے نکل گیا اب نہیں پکڑا جا سکتا' وہ نتیجہ برآمد کر کے رہے گا لیکن یہاں تو بات ہی اور ہو رہی ہے۔ عربی زبان میں عرب لوگ امام اس ساہل کو جو معمار کے پاس رکھتے تھے' کہتے تھے' معمار جو دیوار بناتے ہیں۔ دیوار بنانے والوں کے لیے یہ دیکھنا بڑا ضروری ہوتا ہے کہ دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے۔ اگر اس کا ایک ردا بھی کہیں کسی طرف سے ٹیڑھا ہو جائے تو اس کے بعد ساری دیوار ٹیڑھی ہو جاتی ہے' تو ہر ردا رکھنے کے ساتھ معمار کے لیے اس کا اطمینان ضروری ہوتا ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے اور اس کے لیے اس کے پاس کوئی لمبا چوڑا Instrument (آلہ) نہیں ہوتا۔ ایک تاگے کے ساتھ ایک لٹو ہوتا ہے۔ بس وہ یہ لے کر اوپر بیٹھا ہوا ہوتا ہے۔ اوپر بیٹھا ہوا اُس لٹو کے تاگے کو دیکھتا رہتا ہے کہ دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے۔ یہ معیار' یہ پیمانہ ہوتا ہے دیوار کے پرکھنے کا کہ وہ سیدھی اٹھ رہی ہے یا کہیں سے ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ یہ جو لٹو اور تاگا ہے تو دوستوں نے کہا تھا کہ ہمارے ہاں اسے [1] ساہل کہتے ہیں' اس کو عرب اپنے ہاں امام کہتے تھے۔ یہ ماپنے کا معیار ہے کہ ہمارے اعمال کی دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے یا ٹیڑھی ہو گئی ہے۔ کہا ہے کہ جو کچھ کرتے ہو' ہم سب کو محفوظ کر کے' اس لٹو والے تاگے کے سامنے لے آتے ہیں۔ یہ بتاتا ہے کہ سیدھے چل رہے ہو یا غلط چل رہے ہو۔

انسان کا ہر عمل اس کے اعمال کی اُٹھنے والی دیوار کا ردّا ہوتا ہے

عزیزانِ من! کیا آپ نے رکھا ہے اپنے سامنے یہ لٹو؟ ''باؤ جی! اسی کندھ ای نئیں بنائی' تے لٹو کاہدے لئی رکھنا ہیگا [2]'' لیکن عزیزانِ من! دیوار تو ہر ایک کی بنتی ہے' آپ کا تو ہر ارادہ ایک ردا ہوتا ہے جو دیوار پہ رکھا جا رہا ہوتا ہے۔ تمہیں اس کا شعور ہو یا نہ ہو' ساری زندگی کا ایک ایک سانس اعمال نامہ ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دل میں گزرنے والے خیالات اور نگاہوں کی خیانت بھی تمہارے اعمالنامہ میں درج ہوتی ہے۔ یہ بات تو ہے نہیں کہ ہم دیوار ہی نہیں تعمیر کرتے' دیوار تو تعمیر ہوتی جا رہی ہوتی ہے' ہم فریبِ نفس کی وجہ سے ساہول نہیں رکھتے کہ وہ رکھا تو ابھی پتہ چل جائے گا کہ دیوار ٹیڑھی ہو رہی ہے۔ اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہیں' خود ہی فیصلہ کر رہے ہیں کہ سیدھی اٹھ رہی ہے۔ کہتا ہے کہ یہ خود فیصلے کرنے کی بات نہیں ہے۔ یہاں تو وَ كُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (36:12) ہے یعنی ہر عمل اس اعمالنامہ میں منضبط ہو جاتا ہے۔ اور پھر وہ امام ساہول ایسا مبین ہے' وہ یہ بھی نہیں ہے کہ کہیں

---

[1] یا ساہول (Plumb line)۔

[2] بابو جی! ہم نے دیوار ہی نہیں بنائی تو یہ لٹو کاہے کے لیے رکھنا ہے!

مبہم رہ جائے' معلوم نہ ہو سکے کہ اُس نے صحیح کہا ہے یا نہیں۔ امام ہے اور امامِ مبین ہے۔ آپ نے سن لیا یہ ایک آیت ہمارے سامنے آئی ہے' کہا ہے کہ **نَحْنُ نُحْيِ الْمَوْتٰى (36:12)** مردہ قوم کو زندہ کی سطح پہ لاتے ہیں' انسانیت کی سطح پہ لاتے ہیں' وہاں اُس کے ہاتھ میں قرآن کی شمع دیتے ہیں' اپنا راستہ بھی روشن کرو' انسانیت کی راہیں بھی روشن کرو' جو کچھ کرتا چلا جاتا ہے اُس کے لیے دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ تم نے مستقبل کے لیے کیا کیا ہے' پیچھے آنے والوں کے لیے کس قسم کے نقوشِ قدم چھوڑے ہیں اور ان چیزوں کا فیصلہ تم خود نہیں کر سکتے۔ ایک امام مبین ہے' وہ ہم نے تمہارے اعمالنامہ کے سامنے لٹکایا ہوا ہے' وہ بتائے گا کہ تمہاری دیوار سیدھی اٹھ رہی ہے یا غلط اٹھ رہی ہے۔ یہ غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لیے ایک واضح معیار ہے اور ساتھ کے ساتھ غلط اور صحیح اعمال کو چھانٹ کر الگ کرتا چلا جاتا ہے۔

خدا تعالیٰ کی طرف سے ضابطۂ حیات مل جانے کے باوجود قوموں کی حالت

دیکھا یہ سورۃ یٰسٓ کیا کہہ رہی ہے! لیکن قوموں کی کیا کیفیت ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا اَصْحٰبَ الْقَرْيَةِ (36:13)** ان لوگوں کو یہ حقیقت ایک مثال کے ذریعے سمجھاؤ کہ ایک بستی تھی۔ یہاں ہم نے مثال کے ذریعے بات سمجھائی ہے کہ وہاں ہمیشہ ہوتا یہ رہتا ہے۔ کہا کہ **اِذْ جَآءَهَا الْمُرْسَلُوْنَ (36:13)** ہم نے اپنے رسول بھیجے۔ ان کی طرف ہمارے ہاں سے وارننگ دینے والے پیغاماتِ زندگی دینے والے آئے **اِذْ اَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمُ اثْنَيْنِ فَكَذَّبُوْهُمَا فَعَزَّزْنَا بِثَالِثٍ (36:14)** پہلے ہم نے وہاں دو رسول بھیجے اور ان لوگوں نے ان کی تکذیب کی پھر ہم نے تیسرا رسول بھیجا۔ عزیزانِ من! قرآن نے چونکہ مثل کہا ہے کہ ہم مثال کے طور پہ بیان کرتے ہیں' اس لیے ہمیں ضروری نہیں ہے کہ ہم متعین کریں کہ یہ کون سے رسول تھے جو بھیجے گئے۔ اُس نے تو یہ مثال دی ہے۔ لیکن ہم جبکہ جنت کے آبخوروں کی پیمائش بھی کرتے ہیں تو پھر یہ کیوں نہ متعین کریں۔ لیکن قرآن نے مثال کہا ہے' اس لیے ہمیں متعین کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کہا کہ دو آئے' انہوں نے دو کی بھی پرواہ نہیں کی تو ہم نے ایک اور بھیجا **فَقَالُوْٓا اِنَّآ اِلَيْكُمْ مُّرْسَلُوْنَ (36:14)** کہ وہ پہلے دو رسولوں کی تائید و تقویت کا موجب بنے۔ اس نے بھی اُنہیں کہا کہ ہم تمہاری طرف خدا کا پیغامِ حیات لائے ہیں' میری بات سنو۔ **قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (36:15)** لیکن انہوں نے کہہ دیا کہ تم ہماری طرح انسان ہو۔ بس ایک ہی اعتراض تھا کہ تم تو ہمارے ہی جیسے انسان ہو۔

قرآنِ حکیم نے تو رسالت مآبؐ کو بھی بشر کہا ہے

یہ وہی تو ہم پرستی ہے کہ خدا کی طرف سے جو بھی پیغام لائے' اُس کو مافوق الفطرت ہونا چاہیے۔ یہ اعتراض آتا ہے۔ آپ کو پتہ

ہے کہ ہم نے کیا کیا ہوا ہے۔ سارے قرآن میں رسولوں کے متعلق وہ یہی چیز کہتے ہیں کہ ہم بشر ہیں۔ ہمارے ہاں بحثیں چلی ہوئی ہیں کہ حضور ﷺ بشر تھے یا نور تھے۔ بشریت کا تصور ہمارے ذہن میں نہیں آتا' کچھ نہ کچھ مافوق الفطرت چیزیں ضرور رکھتے ہیں' ہم معجزات رکھتے ہیں ان کے متعلق۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ اعتراض یہ کرتے تھے کہ تم تو ہمارے ہی جیسے بشر ہو' تم رسول کیسے ہو سکتے ہو؟ وہی ہم بھی کرتے ہیں۔ اُس کا نام ہم نے تکریم' عزت' احترام' تقدس' ناموسِ رسالت ﷺ' عام انسانوں جیسے عام انسان نہیں بلکہ کچھ اونچے ہیں۔ اب درجے کی بات ہے' تو کوئی تھوڑے سے اونچے' کوئی پھر وہاں تک پہنچ کے اونچے' یہاں تک کہ

وہی جو مستویٔ عرش تھا خدا ہو کر

اتر پڑا وہ مدینے میں مصطفیٰ ﷺ ہو کر

بشر جب نہ مانا جائے تو پھر تو چل سو چل ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ **قَالُوْا مَآ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا وَ مَآ اَنْزَلَ الرَّحْمٰنُ مِنْ شَیْءٍ اِنْ اَنْتُمْ اِلَّا تَكْذِبُوْنَ (36:15)** ایک انسان کی حیثیت سے یہ بات ہم نہیں مانتے کہ خدا کی طرف سے تم پہ کچھ نازل ہوتا ہے' جس پہ نازل ہونا ہو وہ تو بشریت سے اونچا ہونا چاہیے' اُسے Super Human (فوق البشر) ہونا چاہیے' تم اپنے دعوے میں بالکل جھوٹے ہو کہ تمہاری طرف خدا کی وحی وغیرہ کچھ آتی ہے۔ قرآن نے کہا کہ **قَالُوْا رَبُّنَا یَعْلَمُ اِنَّآ اِلَیْكُمْ لَمُرْسَلُوْنَ (36:16)** وہ رسول کہتے کہ ہمارا پروردگار اس پر شاہد ہے کہ ہم تمہاری طرف اس کے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ وہ علم جو ہم تم کو دیں گے' جو خدا کی طرف سے ملا ہے' وہ تمہیں بتائے گا کہ ہم واقعی خدا کی طرف سے یہ باتیں لائے ہیں۔ کہا کہ **وَ مَا عَلَیْنَآ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِیْنُ (36:17)** اور یہ یاد رکھو! ہمارا فریضہ اتنا ہی ہے کہ جو اُس نے تمہارے لیے پیغام دیا ہے' تم تک پہنچا دیں۔ ہمارا فریضہ ہے ہی نہیں کہ ڈنڈے کے زور سے تم سے منوا بھی لیں۔ یہ فریضہ ہم ادا کر رہے ہیں کہ وہ پیغام تم تک پہنچا دیں۔ اس سے زیادہ ہم تم سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ اس کے جواب میں قرآن نے بتایا کہ **قَالُوْٓا اِنَّا تَطَیَّرْنَا بِكُمْ (36:18)** وہ لوگ ان سے کہتے کہ تم بہت ہی منحوس ہو۔ عزیزانِ من! میں نے یہ طائر کہا تھا۔ یہاں آگے کہا ہے کہ **لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهُوْا لَنَرْجُمَنَّكُمْ وَ لَیَمَسَّنَّكُمْ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیْمٌ (36:18)** یاد رکھ! اگر تم ان باتوں سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں یہاں سے نکال باہر کریں گے یا سنگسار کر دیں گے۔ بہرحال ہم تمہیں اس کی الم انگیز سزا دیں گے۔ میں نے کہا ہے کہ طائر کے معنی اعمالنامہ کے ہیں۔ قرآن نے اسے ایک اور جگہ بطور اصطلاح استعمال کیا ہے۔

ہر انسان کا اعمال نامہ اس کے گلے میں لٹکا ہوگا

کہا ہے کہ وَ کُلَّ اِنۡسَانٍ اَلۡزَمۡنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِیۡ عُنُقِهٖ(17:13) ۔کیا بات ہے کونسی آیت ہے جو سامنے آئے تو ''کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست''۔ یہاں کیفیت یہ ہے کہ ہر ایک کا اعمالنامہ اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہے۔ آگے یہ ہے کہ اب تو وہ لپٹا ہوا ہے' جسے تم قیامت کہتے ہو' وہاں اتنا ہی ہوگا کہ وہاں یہ کھول دیا جائے گا۔ ہاں تو بات میں صرف طآئر کی کہہ رہا تھا۔ وہ لوگ یہ کہتے تھے کہ وہ پرندہ جو ہاتھ سے نکل گیا' اب وہ نہیں پکڑا جاسکتا۔ عرب اس لفظ طائر کو' جو غلط قسم کے اعمال ہوتے تھے' ان کے لیے بھی استعمال کرتے تھے اور کہتے تھے کہ نحوست اس کی وجہ سے آتی ہے جن کو وہ بدروحیں کہا کرتے تھے۔

قرآنِ حکیم کی دعوت دینے والوں کا حشر

یہاں بڑی عجیب چیز آئی ہے۔ وہ ان رسولوں سے کہنے لگے کہ بابا! تم بڑے ہی منحوس ہو' تم صبح شام تباہ ہو جاؤ گے' برباد ہو جاؤ گے' نقصان ہو جائے گا' مر جاؤ گے تم پر عذاب آئے گا' وہ عذاب آئے گا' کہتے رہتے ہو۔ او کوئی خیر کی خبر بھی سنایا کرو' تم بڑے منحوس ہو۔ یعنی وہ خطرات سے آگاہ کرنے والا ہے اور وہ جو یہ بات نہیں مانے گا تو وہ اسے یہی کہے گا کہ تم بڑے ہی منحوس ہو' جب سے آئے ہو تم اسی قسم کی خبریں سناتے ہو کہ تباہ ہو جاؤ گے' برباد ہو جاؤ گے۔ وہ جو خودکشی کرنے چلا جا رہا ہو اُس کو جو کہے گا کہ نہیں' تم بہت دیر زندہ رہو گے' منفعت پاؤ گے' معراج پہ پہنچو گے' تم یہی کہو گے کہ مر جاؤ گے۔ کہا کہ اس نحوست سے باز آؤ' تنگ آ گئے ہیں ہم روز تمہاری یہ باتیں سن سن کر' اگر تم باز نہ آئے تو یاد رکھو! یا تو تمہیں گاؤں سے نکال دیں گے یا یہیں سنگسار کر دیں گے۔ ہوتا ہی یہ ہے کہ جو بھی کسی مجرم سے یہ کہتا ہے کہ اس سے باز آ جاؤ' اس کی سزا بڑی سخت ہوگی تو سب سے پہلا دشمن اس کا یہی ہوتا ہے۔ اور قوموں میں ہوتا ہی یہ ہے۔ آپ کسی کو قرآن کی دعوت دے کر دیکھیے تو سہی' پھر آپ کے ساتھ ہوتا کیا ہے۔ انہیں کہا کہ یا گاؤں سے نکال دیں گے یا یہیں سنگسار کر دیں گے۔ بہرحال وَ لَیَمَسَّنَّکُمۡ مِّنَّا عَذَابٌ اَلِیۡمٌ (36:18) یاد رکھو! تمہیں سخت اذیت پہنچے گی جو تم یہ باتیں ہمارے خلاف کر رہے ہو۔ خطرات سے آگاہ کرنے والے کے ساتھ یہی ہوتا ہے۔

ہر انسان کی شخصیت اس کے اعمال کا عکس ہوتی ہے' ورنہ نہ انسان منحوس ہوتا ہے اور نہ مسعود

قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ قَالُوۡا طَآئِرُکُمۡ مَّعَکُمۡ (36:19) وہ رسول ان سے کہتے کہ جس چیز کو تم نحوست کہتے ہو' وہ سب تمہارے اپنے اعمال کی وجہ سے ہے۔ یعنی جسے تم نحوست کہتے ہو' وہ کہیں باہر سے نہیں آتی' نہ ہماری وجہ سے آتی ہے' وہ تو تمہارے اندر سے بول بول کر کہہ رہی ہوتی ہے کہ نحوست موجود ہے۔ تو یہ جسے ہم کہتے ہیں کہ وہ منحوس ہے تو ان کے بقول سعد اور نحس پھر وہ

ستارے ہوتے ہیں' ان سے ہم گنتے ہیں کہ وہ برجِ حمل میں چلا گیا اور پتہ نہیں کہاں ہے۔ یہ سعد اور نحس پہ تو روز' پوچھو نہیں' فالیں نکالی جاتی ہیں۔ اور یہ بات کہ وہ بڑا منحوس ہے' قرآن نے کہا ہے کہ کوئی شخص بھی منحوس نہیں ہوتا' مسعود نہیں ہوتا' انسان کے اپنے اعمال ہیں جو نحوست بن کر اس پر چھا جاتے ہیں۔ یہ باتیں خارج سے نہیں آتیں' کسی فرد کی وجہ سے یہ کچھ نہیں ہوتا۔ یہاں کہا ہے کہ **طَآئِرُكُمْ مَّعَكُمْ اَئِنْ ذُكِّرْتُمْ (36:19)** ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم نے تم سے کہا کہ آگے نہ جانا' پانی گہرا ہے' ڈوب جاؤ گے اور تم کہتے ہو کہ یا تمہیں مار مار کر ادھ موا کر دیں گے یا گاؤں سے نکال دیں گے۔ کہا کہ کیوں جی! میں نے اس لیے تمہیں آگاہ کیا تھا کہ آگے نہ جاؤ' مر جاؤ گے کہ تم مجھے مار مار کر ادھ موا کر دو گے۔ سوچو تو سہی کہ میں کیا کہہ رہا ہوں اور تم کیا کر رہے ہو۔ کہا کہ **بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ (36:19)** بات اصل میں یہ ہے کہ تم حد سے گزری ہوئی قوم ہو جو ہمدرد اور بہی خواہ کے متعلق یہ بات کہے کہ یا تو ان باتوں سے باز آجاؤ ورنہ ہم تمہیں مار دیں گے۔ اُس سے زیادہ حد سے گزری ہوئی قوم کون ہو سکتی ہے۔ یہ سب کچھ وہ کر رہے تھے۔

انسانیت کے لحاظ سے انگریز حکمران قوم کی نفسیاتی کیفیت' ملوکیت کی ترجمان تھی

کہا ہے کہ **وَ جَآءَ مِنْ اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ رَجُلٌ يَّسْعٰى (36:20)**۔ یہ تو عام لوگ تھے جن میں وہ یہ باتیں کر رہے تھے تو قرآن نے کئی مقام پہ یہ کہا ہے۔ یہ ہمارے ہاں انگریز کے زمانے میں بھی یہ جو افسروں کے لیے بنگلے وغیرہ بناتے تھے' وہ آبادی سے باہر دور بناتے تھے۔ یہ چیزیں' یہ ان کے بنگلے' ان کی کوٹھیاں' شہر سے دور ہوتی تھیں اور وہ اس لیے تھیں کہ وہ عوام کے اندر نہ گھل مل جائیں' وہ انہیں عام سے ممتاز رکھنا چاہتے تھے۔ وہ آبادی سویلین کہلاتی تھی' وہ علاقہ سول کہلاتا تھا' اب بھی ہمارے ہاں سول کا علاقہ پرانی یادداشت کے طور پہ موجود ہوتا ہے۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ اُن ادوار میں بھی اور دورِ ملوکیت میں بھی **اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ (36:20)** شہر سے دور کی جو بستی تھی' وہاں سے ایک شخص بڑی تیزی سے بھاگتا ہوا آیا کہ یہ عوام کہیں ان کو پتھر مار مار کر مار ہی نہ دیں اور **رجل (36:20)** ویسے تو رجل کے معنی مرد ہوتا ہے لیکن عربوں کے ہاں وہ ہر مرد کو رجل نہیں کہتے تھے۔ جس میں جرأت' حمیّت' بہادری کی چیزیں ہوتی تھیں' وہ اُسے رجل کہتے تھے۔ ہمارے ہاں بھی فرق کرتے ہیں ''جنے دا پتر ہیں نا' جنا ہویا اے نا[1] ہو'' حالانکہ جنا تو ہر وہ ہے جو پیدا ہوا ہے' جو جنا گیا ہے۔ لیکن فرق کیا گیا ہے اور عربی زبان میں بھی فرق کرتے تھے جب وہ رجل کہتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ایک شخص جو جرأت بھی رکھتا تھا اور حمیت بھی رکھتا تھا۔ وہ بھاگتا ہوا **اَقْصَا الْمَدِيْنَةِ** سے آیا' اُس علاقے سے آیا

---

[1] مرد کے بیٹے ہو' صرف پیدا کیے ہوئے ہی نہ بنو۔

جہاں سول آبادی رہتی ہے اور اس نے آ کر کہا کہ قَالَ یٰقَوْمِ اتَّبِعُوا الْمُرْسَلِیْنَ (36:20) اُس نے کہا ہے کہ کیا کر رہے ہو تمہیں وہ بڑی خیر خواہی کی باتیں بتا رہے ہیں پیغامات دے رہے ہیں اور تم ان کی اذیت کے درپے ہو۔ تم ان کا کہنا مانو ان کا اتباع کرو۔

انبیائے کرام کا اسوۂ حسنہ یہ تھا کہ وہ اپنی کسی بات کا معاوضہ نہیں مانگتے تھے

عزیزانِ من! آگے اس نے دو شرطیں دی ہیں بڑی عجیب ہیں کہ کیوں کہنا مانو۔ کہا ہے کہ اتَّبِعُوْا مَنْ لَّا یَسْـَٔلُکُمْ اَجْرًا وَّ هُمْ مُّهْتَدُوْنَ (36:21) اس نے کہا کہ دیکھتے نہیں ہو کہ وہ جس راستے کی طرف راہنمائی کرتے ہیں اور چل رہے ہیں وہ راستہ صحیح ہے تم اُس پہ غور کرو کہ وہ راستہ صحیح ہے۔ میں نے غور کیا ہے کہ وہ صحیح راستے کی طرف راہنمائی کر رہے ہیں اور چل رہے ہیں اور مَنْ لَّا یَسْـَٔلُکُمْ اَجْرًا (36:21) اور تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں مانگ رہے۔ تو بڑی شرط یہ ہے۔

ہر داعی یا مبلغ کے لیے دو شرطوں کا پورا کرنا ضروری ہے

عزیزانِ من! اگر آپ نے کسی سے بات منوانی ہو اور وہ داعی یا مبلغ ہو تو شرط یہ ہے کہ اُس کی زندگی بتا رہی ہو کہ وہ خود صحیح راستے پہ چل رہا ہے۔ پہلی شرط یہ ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ تم یہ سنو کہ وہ کہتا کیا ہے اور یہ نہ دیکھو کہ وہ ہے کیا؟ اگر ''وہ ہے کیا'' والی بات تمہارے لیے قابلِ اطمینان نہیں ہے تو اُس کی کوئی بات بھی تم ماننے کو تیار نہیں ہو گے۔ یہاں مُّهْتَدُوْنَ (36:21) کہا ہے۔ وہ نظر آ جائے گا کہ صحیح راستے پہ چلتا ہے۔ اور اگلی چیز یہ ہے کہ وہ اپنے اس فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی کے لیے کوئی معاوضہ طلب نہ کرے۔ معاوضے اور صلے کے حصول کی تو بیسیوں شکلیں ایسی ہیں جن کو نہ ماپا جا سکتا ہے نہ تولا جا سکتا ہے نہ گنا جا سکتا ہے۔ ان کی بہت سی شکلیں ہوتی ہیں۔ تو دو شرائط ہیں کہ کسی قسم کا بھی معاوضہ تم سے نہیں مانگتا اور خود صحیح راستے پہ چل رہا ہے۔ ہاں! تو اس صاحبِ اثر شخص نے کہا کہ میں نے اس کو دیکھ لیا ہے۔ وَمَا لِیَ لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْ فَطَرَنِیْ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (36:22) میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے کہ ان کی زندگی بڑی پاکبازوں کی زندگی ہے اور کچھ مانگتے نہیں ہیں اور بات جو کہہ رہے ہیں وہ بڑی صاف سیدھی بات ہے۔ اس کے باوجود کہا کہ بھئی! تم جو کچھ جی چاہے ان کے متعلق کہو اس کے باوجود مجھے کیا ہو گیا ہے کہ میں ان کی بات نہ مانوں اور اس خدا کے قوانین کا اتباع نہ کروں جس نے مجھے پیدا کیا ہے اور جس کی طرف یہ مجھے دعوت دے رہے ہیں۔ فَطَرَنِیْ (36:21) انہوں نے ٹھیک کہا ہے کہ پیدا بھی اُسی نے کیا ہے وہ تم کو Nothingness (عدم) سے پیدائش میں لایا ہے۔ وَاِلَیْهِ تُرْجَعُوْنَ (36:22) اور میرے عمل کا ہر قدم اس کی عدالت کی طرف اٹھ رہا ہے اس لیے میں بھاگ کر تو کہیں جا نہیں سکتا اس کے احاطہ سے باہر نہیں جا سکتا۔ تم سب کشاں کشاں اسی کی طرف جا رہے ہو اس سے کسی کو مفر نہیں۔

کسی کے خلاف کیا گیا جرم تو وہ معاف کر دے گا لیکن خود سنکھیا کھانے کا جرم کون معاف کرے گا

میں نے پچھلے درس میں ہی یا اس سے پہلے کہا تھا کہ قرآن نے صحیح راستے پر آنے کے لیے جو دو شرطیں قرار دی ہیں ان میں ایک تو یہ ہے کہ اس قوم تک یہ پیغام پہنچے اور دوسرا یہ ہے کہ اُس میں اس کے سمجھنے کی صلاحیت ہو۔ تو اس سے یہ بھی نظر آیا کہ وہ **اَقْصَاالْمَدِیْنَةِ** سے جو رجل آیا ہے تو اس میں یہ صلاحیت تھی' وہ بات کو سمجھا' اُس نے آ کر اس بات کو مانا بھی' اور اُس نے یہ کہا کہ **ءَاَتَّخِذُ مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً اِنْ یُّرِدْنِ الرَّحْمٰنُ بِضُرٍّ لَّا تُغْنِ عَنِّیْ شَفَاعَتُهُمْ شَیْـًٔا وَّلَا یُنْقِذُوْنِ (36:23)** کیا یہ جن قوانین خداوندی کا ذکر کر رہے ہیں ان کو چھوڑ کر' ان کی خلاف ورزی کر کے' میں اور انسانوں کے قوانین اور ان کی اطاعت اور ان کے راستوں کے اوپر چلوں تو اس کا مجھے جو نقصان ہوگا اس کی تلافی کون کر سکتا ہے؟ مجھے یہ بتاؤ ان کے عجز و ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ اگر خدائے رحمان کے قانونِ مکافات کی رو سے مجھے میری کسی غلط روش کے نتیجہ کے طور پر کوئی نقصان پہنچ رہا ہو تو ان ہستیوں کا میرے ساتھ ہونا مجھے کوئی فائدہ نہ پہنچا سکے گا۔ وہ مجھے اس نقصان سے قطعاً نہ بچا سکیں گے۔ اسے یوں سمجھو کہ وہ کہہ رہا ہے کہ سنکھیا کھاؤ گے تو ہلاک ہو جاؤ گے۔ یہ کہتا ہے کہ نہیں' کچھ نہیں بگڑے گا۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ وہ جو میں نے کھایا اور اس کے قانون کے مطابق جو ہلاکت ہوئی' اس کا ازالہ کون کرے گا؟ مجھے اس کا اطمینان کیسے دلاؤ گے ورنہ دلیل و برہان کی رو سے تو تمہارے پاس کوئی چیز نہیں ہے جس سے تم کہو کہ نہیں اسے چھوڑو اور یہ جو ہم کہتے ہیں اس کو مانو۔ یہ غلط بات ہے۔ مجھے اس سے کوئی نہیں چھڑا سکے گا۔ **اِنِّیْٓ اِذًا لَّفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (36:24)** اگر اس بین دلیل کے بعد بھی میں غلط ہی راستہ اختیار کروں اور ایک تو غلط راستہ اور پھر کھلے ہوئے غلط راستے پہ' سائن بورڈ کہہ رہا ہے کہ یہ راستہ مال روڈ کی طرف نہیں جا رہا مزنگ کی طرف جا رہا ہے' جانا میں نے مال روڈ کی طرف ہے' اگر پڑھنے کے بعد بھی میں اُس راستے پہ جاؤں تو میرے جیسا گمراہ کون ہوگا۔ سوچو کہ اگر میں یہ سب کچھ جانتے بوجھتے' ان ہستیوں کو اپنا خدا بنالوں تو مجھ سے زیادہ کھلی ہوئی گمراہی میں اور کون ہوگا؟

آخری وقت پر موت کو دیکھتے ہوئے فرعون کا ایمان لانا' کچھ کام نہ آیا

کہا ہے کہ **اِنِّیْٓ اٰمَنْتُ بِرَبِّكُمْ فَاسْمَعُوْنِ (36:25)** سن لو! میں ایمان لایا خدا کے اوپر جو تم سب کا نشو و نما دینے والا ہے۔ یہ ایمان وہ نہیں ہے جو فرعون لایا تھا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ پہلے تو وہ اپنی ہیکڑی میں رہا۔ کہا کہ **اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰی (79:24)** کون ہے میرے سامنے بولنے والا؟ ہم سب سے بڑے خدا ہیں اور جب وہ ڈوبنے لگا' موت سامنے آئی تو اُس وقت

چلایا کہ میں ربِ موسیٰؑ اور ہارونؑ پر ایمان لایا۔ اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ او! لعنت ہے تجھ پر فرعون میں تو پختگی دکھاتا' موت کے ڈر سے ایمان لاتے ہو' کیا اس کو ایمان کہا جائے گا؟ جاؤ جہنم کے اندر۔ خدا کہہ رہا ہے کہ موت کے ڈر سے اس کا ایمان مسترد ہوا۔ ایمان یہ ہے جو یہ کہہ رہا ہے کہ کوئی کسی قسم کا ڈر نہیں بلکہ ڈر یہ ہے کہ یہ قوم میرے پیچھے پڑ جائے گی۔ اور پھر یہ کہ **فَاسْمَعُوْنِ** (36:25) میں یہ کچھ چوری چھپے نہیں کر رہا ہے' سن رکھو کہ میں ایمان لایا۔ تم بھی میری بات پہ کان دھرو اور اسی کو خدا مانو۔

قرآن حکیم تو اپنی تعلیم کو بڑے حکیمانہ پیرائے میں بیان کرتا ہے

قرآن کا انداز عجیب ڈرامائی ہوتا ہے۔ اُس صاحبِ اثر شخص نے یہ اعلان کیا اور خدا کہتا ہے کہ اُدھر سے ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل نے اعلان کیا **قِيْلَ ادْخُلِ الْجَنَّةَ** (36:26) کہا کہ اوئے آجنت میں داخل ہو جا' تیرے لیے جنت کے دروازے کھل گئے ہیں۔ قرآن کا بڑا خوبصورت انداز ہوتا ہے ورنہ جنت میں تو کہیں بعد میں داخل ہونا ہے' کیا بات ہے! کہا کہ اُسی وقت آؤ' جنت میں داخل ہو جاؤ۔

عزیزانِ من! یہاں ایک لفظ آیا ہے اور میں اگلے درس پہ یہ ساری چیزیں لاؤنگا۔ بات یہ چل رہی تھی کہ وہ جنہوں نے نہیں مانا' جو تباہیوں کی طرف جا رہے ہیں' تباہ ہونے والے ہیں' وہ ان میں سے الگ ہوا ہے' اُنہیں گالی نہیں دیتا' اُنہیں برا نہیں کہتا۔ قرآن بتاتا ہے کہ **قَالَ يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ** (36:26) کہا کہ وائے افسوس' اے کاش' میری قوم سمجھ سکتی کہ جو وہ کر رہے ہیں' اُس کا نتیجہ کیا ہے اور جس کی طرف میں دعوت دے رہا ہوں اس کا مآل کیا ہے۔ یہاں لفظ **يٰلَيْتَ** آیا ہے۔ میں اِس تصور کو اگلے درس میں Develop کرونگا۔

فکرِ قرآن انسان میں بڑی بلند ظرفی پیدا کر دیتی ہے

عزیزانِ من! اگلی آیت میں یہ بات آ رہی ہے اور یہ بہت بڑی چیز ہے۔ مجرم ہیں' مان نہیں رہے' ڈر بھی ہے کہ شاید میرے اوپر بھی نہ حملہ کر دیں' ان کے خلاف عداوت اور نفرت کے جذبے نہیں ہیں' تاسف اور ہمدردی کے جذبے ہیں: او کم بختو! کیا کر رہے ہو؟ کہا ہے کہ **يٰلَيْتَ قَوْمِيْ يَعْلَمُوْنَ** (36:26) اے کاش! میری قوم سمجھ سکتی' اے کاش! میری قوم کو علم ہوتا۔ **بِمَا غَفَرَلِيْ رَبِّيْ وَجَعَلَنِيْ مِنَ الْمُكْرَمِيْنَ** (36:27) اے کاش! انہیں علم ہوتا کہ اس ایمان کے صلے میں' خدا کی طرف سے کیا کچھ ملتا ہے! ان کی

محرومی کے اوپر اس کو تاسف ہے' غصہ نہیں آ رہا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اگلی آیت میں یہ بات آتی ہے۔ کہا یہ ہے کہ یہ کیفیت تھی اُن کی' اُنہوں نے نہیں مانا۔ یہ ادھر آ گیا اور وہ اپنی ضد پہ اڑے رہے۔

عزیزانِ من! سورۃ یٰسٓ کی آیت 27 تک ہم آ گئے' 28 ویں آیت سے ہم آئندہ درس میں لے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

تیسرا باب: سورۃ یٰسٓ (آیات 28 تا 44)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عزیزانِ من! آج جون 1980ء کی 27 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یٰسٓ کی آیت 28 سے ہو رہا ہے: (36:28)۔

آسمانوں سے فرشتوں کے اترنے کے تصور کی حقیقت و ماہیت

سابقہ درس میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ مخالفین کی بڑی شدت تھی، وہ انتہا تک پہنچے ہوئے تھے اور وہ وقت آ گیا تھا کہ ان کے اعمال ان کی تباہی بن کر ان پر مسلط ہو جائیں۔ آپ دیکھیے کہ ہمارے ہاں جو یہ چیزیں مشہور ہیں کہ ایسے وقت میں خدا کی طرف

سے چھپے ہوئے لشکر آیا کرتے ہیں اور وہ مدد کیا کرتے ہیں۔ یہ جو ذہنوں میں ہے کہ ایسے وقت میں خدا کی طرف سے چھپے ہوئے لشکر آیا کرتے ہیں اور مدد کیا کرتے ہیں۔ یہ جو ذہنوں میں ہے کہ ایسے وقت میں آسمان سے خدا فرشتوں کا نزول کیا کرتا ہے اور وہی تیر چلاتے ہیں' وہی تلواریں چلاتے ہیں' یہ بیٹھے دعائیں مانگتے ہیں۔ اب اندازہ لگائیے کہ کس انداز سے قرآن کہتا ہے کہ ان کی تباہی کا وقت آ گیا ہے۔ **وَمَآ اَنۡزَلۡنَا عَلٰی قَوۡمِهٖ مِنۡۢ بَعۡدِهٖ مِنۡ جُنۡدٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَمَا كُنَّا مُنۡزِلِيۡنَ (36:28)** ان کی تباہی کے لیے ہم آسمان سے کوئی لشکر نہیں اتارتے اور ہم لشکر اتارا ہی نہیں کرتے' نہیں اتاریں گے اور اس کے بعد یہ ہے کہ یہ ہوا ہی نہیں کرتا کہ ہم آسمان سے لشکر بھیج کر ان کی تباہی کریں۔

جیسا آپ کو معلوم ہے' میں نے پورا ایک درس خدا اور بندے کے باہمی تعلق پر وقف کیا تھا قرآن کی رو سے یہ رفاقت کا تعلق ہوتا ہے کہ خدا کی مشیت کے پروگرام' انسانوں کے ہاتھوں سے تکمیل تک پہنچتے ہیں۔ وہی (اسد اللہ خاں) غالب (1797-1869) کا شعر ہے کہ تیرِ قضا خدا کے ترکش میں تو رکھے ہوتے ہیں لیکن وہ چلتے ہیں محمد ﷺ کی کمان میں آ کر [1]۔ تو یہ جو کہا ہے کہ ہم آسمان سے فرشتے نہیں بھیجا کرتے' زمین پہ ہی جو ہمارے ہاں کے وہ مسجودِ ملائک ہیں' جن کے سامنے فرشتے سجدہ کرتے ہیں' ان کے ہاتھوں سے ہمارے پروگرام کی تکمیل ہوتی ہے' اس لیے **جُنۡدٍ مِّنَ السَّمَآءِ (36:28)** نہیں ہوگا' آسمان سے لشکر نہیں اتریں گے' یہیں جماعتِ مومنین کو اور مجاہدین کو اُس نے حزب اللہ کہا ہے' خدا کی پارٹی خدا کا لشکر' تو یہ انسان ہی ہوتے ہیں جن کے ہاتھوں یہ کام تکمیل تک پہنچتا ہے۔

کعبہ پر حملہ کے سلسلہ میں ابابیلوں کی کنکریوں کے افسانے کی حقیقت اور قرآن کا اندازِ بیان

آخری پارے میں آئے گا تو وہاں میں عرض کرونگا جو ہمارے ہاں افسانہ مشہور ہے کہ کعبے پر یمن کے عیسائی حاکم ابرہہ' جو شاہِ حبش تھا' نے چڑھائی [2] کی تو خدا نے ابابیلوں کو بھیج دیا کہ وہ کنکریاں اٹھا کر اوپر سے مارتی تھیں اور ان کی کنکریوں نے ان کا بھرکس نکال دیا۔ وہ تو میں نے عرض کیا ہے کہ چیستانیں ہیں' افسانے ہیں۔ قرآن کہتا ہے ہم تو آسمان سے لشکر بھیجا ہی نہیں کرتے۔

---

[1] تیرِ قضا ہر آئینہ در ترکشِ حق است اما کشادِ آں زکمانِ محمدؐ است

[2] یاد رہے 570ء میں جو حضور ﷺ کا سنِ ولادت ہے' یمن کے عیسائی حاکم ابرہہ نے ارادہ کیا کہ مکہ کو فتح اور خانہ کعبہ کو منہدم کر دیا جائے تا کہ عربوں کی مرکزیت فنا اور قریش کی سیادت تباہ ہو جائے۔ اس کے لیے اس نے بجائے اس کے کہ برملا اعلانِ جنگ کرتا' اپنے ساتھ ہاتھیوں کی ایک عظیم الشان فوج لے کر خفیہ خفیہ بڑھنا شروع کیا (پرویزؒ: معراجِ انسانیت' 1949' ص۔ 366)۔

اس زمانے میں تو کعبہ کفار کے قبضے میں تھا اور کعبہ کیا اُس زمانے میں تو خدا کا گھر نہیں' بت کدہ تھا' اُس بت کدے کی حفاظت کے لیے تو خدا نے یہ انتظام کیا اور اگر آج کوئی ہم سے پوچھے' جو ابھی پچھلے دنوں کعبے کے اوپر یہاں چڑھائی کر دی تھی' ان لوگوں نے جن کو باغی کہا جاتا تھا' اور انہوں نے آ کر کتنا عرصہ قبضہ بھی کیا' تو وہ انہی انسانوں کے ہاتھوں اس کی صفائی ہوئی' خدا نے تو کوئی لشکر بھیجا ہی نہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ہم بھیجا ہی نہیں کرتے' انسانی دنیا میں ہمارا پروگرام انسانوں کے ہاتھوں سے ہی تکمیل تک پہنچتا ہے۔ **وَمَا كُنَّا مُنْزِلِيْنَ (36:28)** اور ہم فرشتوں کے لشکر نہیں اتارا کرتے۔ پھر ہوتا کیا ہے؟ کہتا ہے کہ غلط معاشرے میں پھر افراد اتنے تنگ آ جاتے ہیں کہ **اِنْ كَانَتْ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً فَاِذَا هُمْ خَامِدُوْنَ (36:29)** جب معاشرے میں غلط کاریوں کی' غلط کوشیوں کی' انتہا ہو جاتی ہے' دنیا تنگ آ جاتی ہیں' تو ان کے سینے سے ایک چیخ بلند ہوتی ہے' اس قوم پر بس ایک جھپٹ پڑتی ہے اور وہ معاشرہ بجھے ہوئے شعلے کی طرح ہو جاتا ہے' اُن میں زندگی اور حرارت کی رمق تک باقی نہیں رہتی۔ انداز عجیب ہے' ادب کی دنیا میں بھی نہیں۔ پوچھیے کہ قرآن کا انداز کیا ہے! حقائق کی ایسی دنیا کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیتا ہے وہ تو میں ابھی عرض کرونگا' آیتیں ساتھ آ رہی ہیں اور پھر ادب کی دنیا میں بھی کس قدر حسین تشبیہات اور استعارات دی ہیں۔ کہا ہے کہ وہ ایک چیخ بلند ہوتی ہے' معاشرے کے مصیبت زدہ افراد کے سینے سے' اور پھر وہ باطل کا معاشرہ بجھے ہوئے شعلے کی طرح راکھ بن جاتا ہے۔

مجرم کے ساتھ روا رکھے جانے والے سلوک کے سلسلہ میں قرآنِ حکیم کی انقلاب آفریں راہنمائی

اب وہاں وہ آئی آیت' جس کے لیے میں نے کہا تھا' کہ اُسے میں اس درس پر اٹھا رکھتا ہوں۔ یہ بہت ہی اہم چیز ہے جو سامنے آئی ہے۔ ہمارے ہاں ہی نہیں دنیا میں بھی انداز یہی ہے کہ اگر کسی سے کوئی لغزش ہو جاتی ہے' کوئی جرم سرزد ہو جاتا ہے' ہر شخص اُس سے نفرت کرنے لگ جاتا ہے' جنہوں نے بدلا لینا ہوتا ہے وہ تو عداوت اور انتقام کے جذبے میں اُس کے خلاف بالکل پاگل ہو جاتے ہیں' اتنی شدت سے مخالفت ہوتی ہے' جنہوں نے بدلا نہیں لینا ہوتا ان کی نگاہوں میں بھی اس شخص سے نفرت ہو جاتی ہے' کوئی اُسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتا' کوئی اس کے حق میں کلمۂ خیر نہیں کہتا' کوئی اُس سے ہمدردی نہیں کرتا۔ عزیزانِ من! میں کیا عرض کروں کہ قرآن نے کیا کہا ہے؟ یہ جو کچھ اُس زمانے میں کہہ گیا ہے' آج آہستہ آہستہ دنیا اُس طرف آ رہی ہے' آج کی سائیکولوجی یہ کہہ رہی ہے کہ یہ مجرم بجائے اس کے کہ ان کے خلاف نفرت اور عداوت کے جذبات پرورش پائیں' یہ تو تمہاری ہمدردی کے مستحق ہوتے ہیں' یہ مریض ہوتے ہیں کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ **فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ (2:10)** یہ سائیکولوجیکل کیس ہیں۔ اس کا یہی ترجمہ ہے۔ ان میں Complexes (الجھنیں) ہوتے ہیں۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ ان کا علاج کرنا چاہیے' ان کے ساتھ ہمدردی

کرنی چاہیے' دھتکارنا نہیں چاہیے۔ اس سے تو ان کا مرض اور بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ چیز کہ اُس سے جو لغزش ہوئی ہے یا جو جرم سرزد ہوا ہے' اُس جرم کو تو بُرا کہو' اُس انسان کو برا نہ کہو' وہ تمہاری ہمدردی کا مستحق ہے۔ جرم اور مجرم میں فرق کرنا بڑی گہرائی تک جانا چاہتا تھا۔ تم اُس سے ہمدردی کرو گے تو تم دیکھو گے اُس کی آنکھوں میں اشکِ ندامت آجائیں گے' وہ اپنے کیے پر شرمندہ ہو جائے گا' اُس میں اصلاح کا جذبہ بیدار ہو جائے گا۔ کہا کہ یہ الگ بات ہے اور یہاں سائیکولوجسٹ بھی مانتے ہیں کہ بعض Cases (وقوعے) اتنی انتہا تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں جیسے لا علاج مرض' ایسے مریض جن میں زندگی کا کوئی امکان نہیں رہتا ہے' وہ صرف مستثنیات میں سے ہوتے ہیں ورنہ وہ کہتے یہی ہیں یعنی آج بات' ان لوگوں نے' ان سائیکولوجسٹ نے' کہی ہے کہ جرم اور مجرم میں فرق کیا کرو' وہ اس کے باوجود انسان رہتا ہے۔ ایک غلطی کی ہے' اُس سے ایک لغزش ہوگئی ہے' اُس سے اس کی انسانیت ختم نہیں ہوتی۔

جرم کے باوجود مجرم کے لیے تکریمِ انسانیت کے تصور کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا

آپ کو معلوم ہے کہ میں مسلسل قرآن کا پیغام دیئے جا رہا ہوں کہ انسانیت کی تکریم' انسان کی تحریم' شرفِ انسانیت ہے' دین کی اصلِ لم یہ ہے کہ آدمی آدمی ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ اب اُس سے جیسے کہ اس کے حسنِ عمل کی بنا پر اس کے درجات بڑھتے ہیں اگر اُس سے لغزشیں سرزد ہوتی ہیں تو قرآن کہہ رہا ہے کہ وہ تمہاری ہمدردی کا مستحق ہوتا ہے تا کہ اُس کا علاج ہو جائے۔ یہ چیز ذہن میں رکھیے کہ جرم قابلِ نفرت ہوتا ہے' چوری قابلِ نفرت ہوتی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جو چور ہے اُس کے ساتھ ہمدردی کرو' تو اُس کی اصلاح ہو جائے گی۔ اس کے لیے تمہارے سامنے تاسف کا جذبہ ہونا چاہیے۔

زندگی بھر کی اذیت ناکیوں کے باوجود نبی اکرمؐ کی کریمانہ کیفیت میں کچھ بھی فرق پیدا نہیں ہوا

جو سلسلۂ رشد و ہدایت خداوندی آسمان سے آتا ہے یعنی وحی کی مہبط رسولِ خدا تھے' ان کی کیفیت کیا ہے' وہاں سے بات شروع ہوتی ہے۔ ان میں تاسف کا جذبہ' محبت کا جذبہ' ہمدردی کا جذبہ' تھا لیکن نفرت کا' بغض کا' عداوت کا' دشمنی کا' جذبہ نہیں تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ نبی اکرم ﷺ کے ساتھ' آپ ﷺ کے مخالفین نے کیا کچھ نہیں کیا' کون کون سی اذیت تھی جو نہیں پہنچائی گئی' کون کون سی مصیبت تھی' جو وہ نہیں لائے' تیرہ برس مکے کی زندگی کے اندر ایک دن بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا' صاحب! اور مدینے کی زندگی میں بھی گو کہ آپؐ ان کو چھوڑ چھاڑ کر ادھر آگئے' اس پہ بھی یہ کیفیت تھی کہ مسلسل جنگیں اور لڑائیاں اور یہ کچھ ہو رہی ہیں۔ اس کے باوجود نبی اکرم ﷺ کی کیا کیفیت ہے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی طرف سے یہ سلوک ہو رہا ہو' آخر میں تو انہوں نے آپ ﷺ کو جان سے مار دینے کی سازش کر لی تھی' وہ تو ناکام رہے لیکن وہ اس حد تک پہنچ چکے تھے۔ اُدھر سے یہ کیفیت تھی' اِدھر سے ری ایکشن کیا تھا' ردِعمل

کیا تھا؟ پھر سوچیے کہ عام طور پر ہمارے ذہنوں میں یہی آیا کہ دشمن اس حد تک پہنچا ہوا ہو تو اس کے خلاف کچھ تو نفرت، بغض اور دشمنی اور عداوت کا جذبہ بیدار ہونا چاہیے لیکن نہیں۔ خدا کو رسول اللہ ﷺ سے کہنا پڑا کہ **فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا** (18:6) ہمیں تو یہ نظر آ رہا ہے کہ اگر اسی طرح تُو ان کے غم میں گھلتا رہا کہ یہ کیوں صحیح راستے پہ نہیں آ جاتے تو ان کا تو پتہ نہیں، تُو اپنی جان ضرور گنوا دے گا۔ دیکھتے ہیں یہ کیا جذبات بیدار ہو رہے ہیں ''تُو تو ان کے غم میں اپنی جان گھلا لے گا کہ یہ کیوں تباہی سے نہیں بچتے''۔ ہمارے ہاں کے عام جذبات جو ہیں یا ردِعمل جو ہے وہ ہمارے سامنے ہے۔ ایسے وقت میں ہر قسم کی اور کچھ نہیں تو بد دعائیں ہی سہی وہ تو ضرور نکلتی ہیں۔ طائف میں جب حضور ﷺ گئے ہیں، تاریخ یہ بتا رہی ہے تو وہاں کے لوگوں نے، حالانکہ دعوت دی تھی، بلایا تھا، لیکن اُس کے باوجود وہاں پتھر بھی مارے، لہولہان بھی کر دیا، واپس آئے، ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے، سایہ تھا ایڑی سے لہو پونچھ رہے تھے، زبان سے کچھ کہہ رہے تھے، کسی نے آہستہ سے سنا کہ معلوم نہیں ان کو کتنی کتنی بڑی گالیاں دیتے ہونگے، تو آپ ﷺ کہہ رہے تھے کہ ''یا اللہ! میں تو انہیں کچھ نہیں کہونگا، تُو بھی انہیں کچھ نہ کہنا، اس لیے کہ یہ جاہل ہیں، جانتے نہیں ہیں کہ میں کیا کہہ رہا ہوں''۔ یعنی اپنی طرف سے تو کچھ نہیں کہنا تھا، خدا سے یہ کہہ رہے ہیں کہ کہیں تجھے بھی غصہ نہ آ جائے (جیسا کہتے ہیں) تُو میری خاطر انہیں کچھ نہ کہنا، یہ وہ قوم ہے جو جانتی نہیں ہے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں، تو جو نہیں جانتا اُس کو کیا کہنا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ کیا کہہ رہے ہیں آپ ﷺ اور کچھ نہیں تو بد دعا ہی کیجیے۔ کہا کہ مجھے تو خدا نے **رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ** (21:107) کہا ہے۔ جو عالم کے لیے رحمت ہے، وہ کسی کے اوپر لعنت کیوں برسائے۔ یہ ہے سینے کی کشادگی یہ ہیں وہ اخلاق جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے، یہ ہیں وہ لوگ جو خدا کے نظام کو دنیا کے اندر قائم کرنے کے لیے آئے ہیں۔ وہ فرق کرتے تھے کہ یہ جاننے والے ہیں اور یہ نہیں جاننے والے۔ یعنی یہ کیفیت خدا کہہ رہا ہے کہ ''تُو تو اپنی جان گھلا لے گا کہ یہ لوگ تباہی سے کیوں نہیں بچتے''۔ کہیں کوئی انتقامی جذبہ نہیں آ رہا۔ یہاں پھر لفظِ انتقام پہلے آ چکا ہوا ہے۔ میں عرض کر دوں کہ یہ ٹھیک ہے قرآن میں خدا کے لیے انتقام (3:4;5:95;14:47;39:37) آیا ہے لیکن ہماری دشواری یہ ہے کہ ہم عربی زبان کے الفاظ، قرآن کے الفاظ کا، جو ترجمہ ہے وہ اپنی زبان میں کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں جو انتقام کے معنی ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ عربی زبان میں بھی انتقام کے یہی معنی ہونگے۔

قرآنِ حکیم مجرم سے نفرت کی بجائے اس سے ہمدردی کا سبق دیتا ہے

بات یہ آ رہی تھی کہ قرآنِ کریم جرم اور اُس انسان میں، جس سے وہ لغزش ہو گئی ہو، فرق کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جرم کو برا کہو، مجرم

سے نفرت نہ کرو‘ وہ تمہاری ہمدردی کا مستحق ہے‘ اُس کے علاج کی فکر کرو‘ اس کی اصلاح کی فکر کرو‘ اُس کے خلاف بغض اور نفرت اور انتقام کے جذبات تمہارے اندر نہ پیدا ہوں۔ اس سے مجرم کا تو شاید کچھ نہ بگڑے‘ تمہارا کچھ باقی نہیں رہے گا۔ جس دل کے اندر انسان کے خلاف ذلت کے جذبات اور نفرت کے جذبات پیدا ہو جائیں وہ خود سطحِ انسانیت سے گر جاتا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ٹھیک ہے قانون کی رو سے سوسائٹی یا معاشرے کا نظم وضبط بھی ضروری ہوتا ہے‘ اُس کا تحفظ بھی ضروری ہوتا ہے‘ اُس کو روکنے کے لیے سزائیں بھی کچھ ہوتی ہیں۔ سائیکولوجی تو آج یہ کہہ رہی ہے کہ یہ بھی علاج کا ایک طریق ہوتا ہے۔ لیکن بات قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ اُس کے خلاف تمہارے دل میں انتقام اور بغض اور نفرت کے جذبات پیدا نہیں ہونے چاہئیں‘ تاسف کے جذبات‘ ہمدردی کے جذبات‘ پیدا ہونے چاہئیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ نبی اکرم ﷺ کے متعلق تو قرآن نے خود بتا دیا کہ اتنے گہرے دشمن‘ جنہوں نے ساری عمر مسلسل دشمنی میں گزار دی‘ ان کے متعلق بھی قرآن یہ چیز کہہ رہا ہے کہ مجھے تو یہ خطرہ ہے کہ ’’تُو کہیں اس غم میں اپنی جان ہی نہ گنوا دے کہ یہ لوگ کیوں تباہی سے نہیں بچ رہے‘‘۔ وہ تباہی تو ان کے اپنے جرائم کی بنا پہ آ رہی تھی۔ وہ جو جرائم ہیں ان کو ایک ایک کر کے قرآن گناتا ہے‘ نبی اکرم ﷺ ان کو اُس سے متنبہ کرتے ہیں لیکن وہ جو جرائم کے مرتکب انسان ہیں‘ ان کے متعلق وہ یہی کہتا ہے کہ ان کے ساتھ ہمدردی کے جذبات رکھو‘ انتقام کے اور بغض کے نہ رکھو‘ ان کی اصلاح کی فکر کرو‘ ان کے علاج کی فکر کرو‘ یہ بیمار ہو گئے۔ ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی تو یہ کیفیت ہے۔

عیسائیت کے ہاں رحم کا مفہوم قرآن حکیم کے تصور سے مختلف ہے

جو آیت میرے سامنے آ رہی ہے‘ عزیزانِ من! جہاں تک میری نگاہ میری یاوری کرتی ہے‘ مذہبی دنیا کی کسی کتاب میں بھی یہ الفاظ نہیں۔ عیسائیت کا دعویٰ یہ ہے کہ "God is Mercy" (خدا رحم ہے)‘ ان کے ہاں رحم کا ایک الگ عقیدہ ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں جو ہم سمجھتے ہیں کہ رحم ہے۔ میں عرض کر دوں کہ ان کے ہاں یہ چیز بڑے دھڑلے سے‘ بڑی شدت سے کہی جاتی ہے کہ ہمارے ہاں انسانیت کی ساری عمارت رحم کی بنیاد پہ اٹھتی ہے۔ یہ بڑا غلط ہے‘ رحم کا ان کے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ خدا نے انسانوں کو پیدا کیا تو ان کے اولیں ماں باپ کا جو گناہ تھا‘ ہر پیدا ہونے والا بچہ اُس گناہ کو اپنے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور انسان کے کوئی اچھے عمل اُس گناہ کے دھبے کو دھو نہیں سکتے تو جب یہ کیفیت پیدا ہوئی تو اُس پہ پھر اللہ میاں کو بڑا افسوس ہوا‘ تاسف ہوا کہ یہ سارے انسان جتنے دنیا میں چلے آ رہے ہیں‘ یہ تو سب جہنم میں چلے جائیں گے۔ یعنی خود ہی یہ سارا کچھ کیا اور خود ہی اس کے اوپر افسوس آ رہا ہے کہ یہ تو جہنم میں چلے جائیں گے اور پھر یہ کہ اپنے اعمال کی بنا پر یہ جنت میں جا نہیں سکتے۔ ’’تے بیٹھا ہن سوچن ڈیا سی رب۔

اک دن تے (معاذ اللہ) پُتر نے کہیا کہ ابا جان! اج تسی ایس طراں ہو گل کی اے؟ کہن لگے گل کی اے ❶''؟ یہ ہے ان کے ہاں عقیدہ کہ اُس نے کہا کہ مجھے اس مخلوق کے اوپر ترس آ رہا ہے کہ ان کے بچنے کی صورت کیا ہو؟ اُس نے کہا ہے کہ پھر ایک ہی طریقہ ہوسکتا ہے کہ آپ مجھے بھیج دیجیے' صلیب پہ چڑھا دیجیے' میرا خون جو ہے اُس کا خوں بہا یہ لیجیے کہ ان کے گناہ معاف کر دیجیے تا کہ یہ جنت میں چلے جائیں۔

خدا تعالیٰ کی ذات بھی قوموں کی تباہی پر افسوس کا ہی اظہار کرتی ہے

اُن کے ہاں یہ **"God is Mercy"** ہے تو اندازہ لگائیے کہ اس کے اندر کوئی تُک ہے!! یہاں وہ سوال نہیں ہے' یہاں کیفیت یہ ہے کہ مجرم کو مریض سمجھو' اُس کی اصلاح کی فکر کرو یعنی قرآن یہاں تک آ گیا ہے کہ یہ لوگ اپنی اس مخالفت' اس سرکشی اور اس قسم کے جرائم کی شدت میں' اس انتہا تک جا پہنچے ہیں کہ اب تباہی ان کے سر پہ منڈلا رہی ہے' اب انہیں کوئی بھی اس بربادی سے بچا نہیں سکتا۔ جب قوموں کی یہ حالت ہو جاتی ہے' تو ایسے وقت میں وہ قوم تباہ ہو جاتی ہے۔ وہ قوم اب تباہ ہو رہی ہے۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن نے کہا یہ ہے کہ ہم قوموں کی تباہی کے لیے آسمان سے لشکر نہیں اتارا کرتے' قومیں اپنے جرائم کے' اپنے غلط اعمال کے نتائج کی وجہ سے' خود تباہ ہوتی ہیں اور انسانوں کے ہاتھوں سے تباہ ہوا کرتی ہیں' ہم وہاں سے لشکر نہیں بھیجتے۔ ہوتا یہ ہے کہ معاشرے کے اندر اس قدر زیادتیاں' استبداد' مظالم شدت اختیار کر جاتے ہیں کہ قوم کے سینے سے ایک چیخ اٹھتی ہے اور وہ پوری قوم بجھے ہوئے شعلے کی طرح ہو جاتی ہے۔ اور اس مقام پہ وہ کہتا ہے کہ جب وہ قوم اس طرح تباہ ہو رہی ہے تو سنیے! کیا چیز ہوتی ہے؟ یہ کہ خدا کی طرف سے آواز آتی ہے کہ **يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ (36:30)** او میرے بندو! تم نے یہ اپنے ساتھ کیا کر لیا؟ اُف! کس قدر تاسف انگیز ہے انسانوں کی یہ حالت!

قرآنِ حکیم کی طرف سے انسانی نفسیات کا قائم کردہ معیار اور جرم و سزا کے فلسفے کی وضاحت

میرے پاس تو الفاظ نہیں ہیں' عزیزانِ من! جو میں بیان کر سکوں کہ یہ کیا چیز ہے۔ یہ ہے جس قسم کا کردار اور جس قسم کی نفسیاتی کیفیت خدا اپنے بندوں کے اندر پیدا کرنا چاہتا ہے۔ جو صفاتِ خداوندی کو اپنے اندر منعکس کرنا چاہتے ہیں' ان کی کیفیت اول تو یہ ہے کہ ان کی اصلاح' ان کو بچانے کی تدبیروں میں' فکر میں' وہ رسول اپنی جان گھلاتا چلا جاتا ہے' اس پہ بھی اگر وہ باز نہیں آتے'

---

❶ رب بیٹھا ہوا سوچ میں غرق تھا۔ ایک دن (معاذ اللہ) بیٹے نے کہا کہ ابا جان! آج آپ اس طرح محوِ غم کیوں ہیں' کیا معاملہ ہے؟ کہنے لگے کہ بات کیا ہے!!!

اپنے جرائم کی شدت اور انتہا کی بنا پر وہ تباہ ہوتے ہیں تو اس تباہی پہ بھی جو آواز نکلتی ہے تو یہ نہیں نکلتی کہ ''چنگا ہو یا مرنا چاہیدا سی تینوں[1]'' یہاں یٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ (36:30) کہا ہے' عزیزانِ من! یہ بڑا خوبصورت ہے' اپنے سے کاٹ کر ان کو الگ نہیں کیا ہے ''جس طراں ماں کہندی اے نا بچے نوں: اوتوں کی کرلیا اپنے نال[2]'' بالکل یہ جذبہ نظر آتا ہے۔ یہ کیوں کہا؟ مَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ (36:30) ہم نے انتباہ کرنے والے' خطرات سے آگاہ کرنے والے' تمہاری طرف اتنے بھیجے اوتم نے کسی کو بھی Seriously (سنجیدگی سے) نہ لیا' ہر ایک کو Lightly (ہلکے پھلکے انداز سے ہی) لیتے رہے۔ یہ کہتے رہے کہ نہیں صاحب! ہمارا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا' تم نے ان کا استہزا کیا' انہیں مذاق میں ہی بات ٹالتے رہے اور دیکھا! آج تمہاری کیا کیفیت ہوگئی!!

قرآنِ حکیم' شرف انسانیت کو مجرم کی لغزش سے جدا نہیں کرتا

یہ ہے' عزیزانِ من! جرم وسزا کا فلسفہ قرآن کی رو سے' یہ ہے مجرم اور جرم میں فرق کرنے کا فلسفہ قرآن کی رو سے کہ مجرم کی لغزش اُس کو شرفِ انسانیت سے محروم نہیں کر دیتی۔ مجرم کے لیے قانون کی رو سے جو سزا دے رہے ہیں وہ چیز ہے۔ اگر آپ اس کی تذلیل کرتے ہیں تو خدا کے ہاں وہ تو بخشا جائے گا' آپ نہیں بخشے جاسکتے۔ وہ ہر جرم کو معاف کرتا ہے لیکن تذلیلِ انسانیت کو معاف نہیں کرتا کیونکہ جسے خدا نے مکرم کہا ہے' واجب التکریم کہا ہے' کسی انسان کو کیا حق حاصل ہے کہ وہ اس کی تذلیل کرے۔ ٹھیک ہے سزا اور بات ہے۔ سزا کے معنی یہ ہیں کہ فطرت کی طرف سے تو جرم کا فطری نتیجہ ہوتا ہے' سوسائٹی کی طرف سے بھی بعض مصلحتیں جن کی بنا پہ کچھ سزا ہوتی ہے' جیسے کہ وہ Zoo (چڑیا گھر) سے اگر شیر پنجرے سے کسی طرف بھاگتا ہے تو بہرحال اُس کو پکڑنے کے لیے تدبیریں کی جاتی ہیں تاکہ معاشرہ اس کی خونخواریت سے محفوظ رہے۔ مستبد اور ظالم جو لوگ ہیں ان پہ پابندیاں لگانی پڑتی ہیں۔ سزا اور بات ہے لیکن تذلیل کی بات نہیں ہے۔ اُس وقت بھی آپ کے دل سے تاسف کا جذبہ ابھرنا چاہیے کہ یٰحَسۡرَةً عَلَى الۡعِبَادِ (36:30) اُف! کس قدر تاسف انگیز ہے ان کی حالت کہ مَا يَاۡتِيۡهِمۡ مِّنۡ رَّسُوۡلٍ اِلَّا كَانُوۡا بِهٖ يَسۡتَهۡزِءُوۡنَ (36:30) جو شخص بھی زندگی اور حرارت کا پیغام خداوندی اُن تک پہنچاتا ہے' یہ اُس کی ہنسی اڑاتے ہیں۔ ان سے رسولوں نے آکر کہا یہ تھا کہ اَلَمۡ يَرَوۡا كَمۡ اَهۡلَكۡنَا قَبۡلَهُمۡ مِّنَ الۡقُرُوۡنِ اَنَّهُمۡ اِلَيۡهِمۡ لَا يَرۡجِعُوۡنَ (36:31) او بابا! جو پہلی قومیں گزری ہیں ذرا ان کے انجام اور مآل

---

[1] اچھا ہوا کہ تجھے مرنا ہی چاہیے تھا۔

[2] جس طرح ماں اپنے بچے سے کہتی ہے کہ اُف! یہ تُو نے اپنے ساتھ کیا کرلیا!!

پہ نگاہ ڈالو کہ وہ کس طرح سے تباہ ہوئیں۔ اب اُسی راستے پہ تم چلتے جا رہے ہو تو تمہارا انجام بھی تو یہی ہوگا۔ تم نے کبھی اس چیز پہ غور ہی نہیں کیا' اس کو Seriously (سنجیدگی سے) لیا ہی نہیں' سوچا ہی نہیں کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں۔

تاریخ شاہد ہے کہ انسان کا ہر قدم مکافاتِ عمل کی طرف اُٹھ رہا ہوتا ہے

تاریخی شواہد سے ہم بتا رہے تھے کہ یہ کچھ ہوا کرتا ہے۔ کہا کہ یہ لوگ' اس کے باوجود تمہارے مخالف ہیں۔ اے رسول! یہ لوگ پھر بھی نہیں پلٹتے' پھر بھی صحیح راستے کی طرف نہیں لوٹتے۔ سنو! **وَاِنْ كُلٌّ لَّمَّا جَمِيْعٌ لَّدَيْنَا مُحْضَرُوْنَ (36:32)** وہ قانونِ مکافاتِ عمل ایسا ہے کہ یہ سب کے سب اُس کی گرفت سے نکل نہیں سکتے۔ بظاہر ایسا نظر آتا ہے کہ اُس سے سرکشی اختیار کر کے دور بھاگ رہے ہیں حالانکہ انہیں پتہ نہیں کہ ان کا ہر قدم اُس کی طرف اٹھ رہا ہے' یہ تو خود اس کی طرف چلے آ رہے ہیں' اس کا نتیجہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ہم تو ہر طریق سے کوشش کرتے ہیں کہ یہ کسی طرح اس تباہی سے بچ جائیں لیکن اگر کوئی خودکشی کرنا چاہے تو اُس کو کون بچا سکتا ہے۔

سورۃ یٰسٓ خاص طور پر حیاتِ نو کے رموز اپنے اندر لیے ہوئے ہے

میں نے شروع میں کہا تھا کہ یہ جو سورۃ یٰسٓ ہے' ویسے تو سارا قرآن ہی ہے' لیکن یہ سورۃ خاص طور پہ مُردوں کو زندگی بخشنے کی' نشیبِ حیات آور لے کر آئی ہے' یہ پیامِ مرگ نہیں ہے۔ قدم قدم پہ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن تشبیہات سے' استعارات سے' یہ کہتا چلا جاتا ہے کہ **وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الْاَرْضُ الْمَيْتَةُ اَحْيَيْنٰهَا (36:30)** پھر ہم انہیں بتائیں کہ وہ ذرا اس کے اندر سوچیں۔ یہ اس چیز کی بہت بڑی نشانی ہے کہ زمینِ مردہ کو ہم کس طرح زندگی عطا کرتے ہیں۔ یہ آیت تو ہمارے سامنے آ گئی۔ یہ زندگی بخش ابرِ گہربار' جو اس کی طرف سے آتا ہے' بتا دیتا ہے کہ کس طرح سے ہم زمینِ مردہ کو زندگی بخشتے ہیں۔ میں نے عرض کیا تھا کہ قرآن نے یہ بتایا ہے کہ بارش تو ساری زمین پہ ہوتی ہے' تمام قطعاتِ ارض کے اوپر ہوتی ہے۔ وہ کسی قطعہ میں اور کسی خطے میں بھی بالکل فرق نہیں کرتی' وہ تو ہر نام سنگھ کی زمین پہ بھی اُسی طرح برستی ہے جیسے عبداللہ کی زمین پہ برستی ہے۔ فرق کیا ہوتا ہے؟ جس نے اپنی زمین کو فصل کے لیے تیار کر لیا ہوتا ہے اُس میں سے فصل اگتی ہے اور جس نے اُس کو ویران رکھا ہوا ہوتا ہے اُس پہ بارش کچھ اثر نہیں کرتی۔ یہ جو اُس کی Receptivity (استعدادِ قبولیت) ہے' وہ جو کچھ اُس کی طرف سے آتا ہے' اُس کی قبولیت کا مادہ اور صلاحیت کے مطابق اُس نے تو نتائج برآمد کرنے ہیں۔

خودی کی حیات آفرینیوں سے لطف اندوز ہونے کا طریق

اب یہ دیکھیے کہ خدا اور بندے میں رفاقت (Companionship) کا کتنا گہرا اثر ہے! اُدھر سے یہ سامانِ ربوبیت تو ملتا ہے لیکن اِدھر اس کے لیے بھی تو ضرورت ہے کہ یہ بھی اپنے اندر وہ صلاحیت پیدا کریں کہ اُس کی وہ جو نعمت مفت میں ملی ہے' وہ نتیجہ خیز ہو جائے۔ وہ نہ ملے تو یہ نتیجہ خیز نہیں ہوسکتی' وحی خداوندی نہ آتی تو انسانیت کی فصلیں کبھی برومند نہ ہوتیں۔ وہ آئے اور اگر زمین کو آپ نے اس کے مطابق تیار نہیں کیا' پھر بھی نتیجہ برآمد نہیں ہوسکتا۔ سوال تو یہ ہے کہ زمینِ مردہ کو کس طرح سے ہم زندگی دیتے ہیں۔ یہ ہمارا قانون فطرت ہے جو بے جان اشیا کو بھرپور زندگی اور شادابی عطا کر دیتا ہے۔ ان کے سامنے تو ایک بنجر زمین پڑی ہوتی ہے جس میں تازگی اور شگفتگی کا نام ونشان تک نظر نہیں آتا۔ ہم اُسے' بارش کے ایک چھینٹے سے حیاتِ تازہ عطا کر دیتے ہیں تو **وَاَخۡرَجۡنَا مِنۡهَا حَبًّا فَمِنۡهُ يَاۡكُلُوۡنَ** (36:33) اُس میں فصلیں اُگتی ہیں جو خود ان کے لیے سامانِ زیست بنتی ہیں۔ اور پھر اس طرح سے اس میں غلہ پیدا کرتے ہیں **وَجَعَلۡنَا فِيۡهَا جَنّٰتٍ مِّنۡ نَّخِيۡلٍ وَّاَعۡنَابٍ وَّفَجَّرۡنَا فِيۡهَا مِنَ الۡعُيُوۡنِ - لِيَاۡكُلُوۡا مِنۡ ثَمَرِهٖ وَمَا عَمِلَتۡهُ اَيۡدِيۡهِمۡ** (36:34.35) اس میں کھجوروں اور انگوروں کے باغات اگتے ہیں' اس میں آبِ رواں کے چشمے پھوٹتے ہیں۔ ان درختوں کے پھل بھی انہیں غذا کا کام دیتے ہیں۔ یہ سب کچھ زمین سے پیدا ہوتا ہے' فصلیں پیدا ہوتی ہیں' باغات میں سے پھل اُگتے ہیں' قسم قسم کے پھل ہوتے ہیں' یہ زمین تو تم نے تیار کی تھی' یہ پھل تو تم نے نہیں بنائے تھے۔ کہتا ہے کہ دیکھتے ہو کہ کس طرح سے (تمہاری زمین کی تیاری اور ہمارے قانونِ فطرت) دونوں کی رفاقت کام کرتی ہے: یہ کچھ ہم کر رہے ہوتے ہیں اور وہ کچھ تم کر رہے ہوتے ہو جب یہ دونوں چیزیں ملتی ہیں تو پھر اس کے نتائج خوشگوار نکلتے ہیں۔ ان کے پھل تمہارے لیے غذا کا کام دیتے ہیں۔ یہ کچھ ان کے ہاتھوں کا خود ساختہ پرداختہ نہیں ہوتا۔ یہ ہمارے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

خدا اور بندے کے درمیان رفاقت کی ایک مثال اور قرآن کے معاشی نظام کی وضاحت

عزیزانِ من! آگے کہا کہ **وَمَا عَمِلَتۡهُ اَيۡدِيۡهِمۡ** (36:35) زمین تو انہوں نے تیار کی تھی' یہ باقی سب کچھ ہمارے قانون نے' ہم نے' کیا ہوا ہے۔ اور یہی چیز دوسرے مقام پہ بڑی تفصیل سے قرآن نے بتائی ہے کہ بتاؤ! یہ کچھ تم کرتے ہو یا ہم کرتے ہیں اور اس کے بعد آخر میں کہا ہے کہ جب یہ فصل تیار ہو جائے تو پھر یہ جو تمہارا اور ہمارا کاروبار کا اشتراک تھا' کچھ ہم نے کیا تھا' کچھ تم نے کیا تھا اس کاروباری دیانت کا تقاضا یہ ہے کہ اب مل بیٹھ کر اس فصل کو تقسیم کر لیں کہ اس میں ہمارا کتنا ہے اور تمہارا کتنا ہے۔ تمہاری کیفیت یہ ہے کہ جب یہ کچھ ہوسکتا ہے تو تم سارے کا سارا ہی اٹھا کر لے جاتے ہو۔ کیا کوئی کاروبار بھی اس قسم کا دیانتداری کا ہوتا

ہے؟ یا تو اس سے انکار کرو کہ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ اگر ہم نے کچھ نہیں کیا تو تم پھر فصل اگا کر دیکھو اور ہم تسلیم کیے جا رہے ہیں کہ تم نے کیا ہے۔ یہ اتنا کچھ ہماری دیانتداری کا دیکھو' تم اپنی بددیانتی ملاحظہ فرماؤ کہ بغیر تقسیم کیے خود ہی اٹھا کر لیے جا رہے ہو۔ تو وہاں یہ ہے کہ پھر پوچھتے ہیں کہ صاحب! ہم تو موجود ہیں' آپ سب کچھ لے آئے اور جنہوں نے یہ اتنا کچھ کیا ان کا حصہ کہاں گیا؟ اب آپ کہتے ہیں کہ آپ کا یہ حصہ آپ تک کیسے پہنچائیں' کس کو دیں؟ کہا کہ یہ بھوکوں کو دے دیجیے' ہم تک پہنچ جائے گا۔ کہا کہ ہم تم کو تو نہیں کہتے کہ اپنے حصے کا بھی بھوکوں کو کھلاؤ۔ کیا بات ہے صاحب اس کی! کس کس انداز سے وہ ربوبیتِ عالمینی کی باتیں کرتا چلا جاتا ہے! کہا ہے کہ وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ (56:73)۔ یہ ہیں الفاظ کہ پوچھتے ہو کہ ہمارا حصہ ہم تک کیسے پہنچے؟ بس بھوکوں کو دیدو' ہم تک پہنچ جائے گا۔ کہا کہ اگر آپ دیانتداری سے کاروبار کرو گے' ٹھیک ہے تو اس کا طریقہ یہ ہے۔ اور یہاں کہا کہ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ (36:35) بتاؤ! ایمانداری اور دیانتداری سے حصہ بانٹتے ہو یا نہیں' شکرگزاری کرتے ہو یا نہیں؟ ہمارے حصے کی یا جو کچھ ہم نے اس کاروبار میں تمہارے لیے' یہ سب کچھ کیا ہے اس سے ہمارے قانون کے مطابق فائدہ اٹھاتے ہو یا نہیں؟ ان سے پوچھو کہ کیا تم بھی چاہتے ہو کہ تمہاری کوششیں اس طرح بارآور ہوں؟ اگر تم ایسا چاہتے ہو تو تم بھی ہمارے اس قانون سے فائدہ اٹھاؤ جو قوموں کو حیاتِ نو عطا کرتا ہے۔

عزیزانِ من! دیکھا کہ زمینِ مردہ کو زندہ کیا تو اس زمینِ زندہ کے بعد بات کیا تھی جہاں تک اُس نے پہنچانا تھا؟ کہ زندہ کیا یہ بہت بڑی چیز تھی جو ہم نے کی' پھر دوبارہ تمہاری اور ہماری محنت مشترکہ شروع ہوئی' اس کا نتیجہ برآمد ہوا' اپنا حصہ تم لو' ہمارا حصہ ہمیں دو' ہمارا حصہ اِن لوگوں کو دیدو۔ یہ ہے جسے شکرِ نعمت کہا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ کچھ کرو اور اس کا یقین رکھو کہ اگر تم نے اس قانون کا اتباع کیا تو اُس کے یہ نتائج مرتب ہو کر رہیں گے۔ خدا کے متعلق کبھی ایسا وہم و گمان بھی نہ کرو کہ اس نے جو کچھ کہا ہے ویسا نہیں ہوگا۔ کہا ہے کہ سُبْحٰنَ الَّذِيْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا يَعْلَمُوْنَ (36:36) وہ تو اس سے بہت بلند اور بالا ہے کہ اس میں سے وہ اپنے لیے کوئی روٹی مانگے یا اس قسم کی باتیں کرے۔ تم دیکھتے نہیں ہو کہ اس کے قانونِ فطرت کی رو سے کس طرح نباتات میں قسم قسم کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں اور کبھی ایسا نہیں ہوتا کہ اس کے مقرر کردہ قاعدہ اور قانون کے مطابق عمل کرو تو وہی نتیجہ برآمد نہ ہو اور خود تمہاری اپنی افزائشِ نسل کا سلسلہ بھی اس کے قانونِ فطرت کے مطابق جاری و ساری ہے۔ علاوہ بریں ان چیزوں کی تخلیق کا سلسلہ بھی' جو ہنوز تمہارے حیطۂ علم میں نہیں آئیں۔ بہرحال ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمارا حصہ تو ہے' جسے ہم چاہتے ہیں اُسے ان کو دیدو جن کو تم جانتے ہو اور ایسے بھی ہیں جنہیں تم ابھی نہیں جانتے ہم تمہیں بتائیں گے' یہ ان کو دیدو۔ اس طرح سے یہ جو کاروبارِ حیات ہے وہ چلے۔ زمینِ مردہ کو ہم اس لیے زندہ کیا کرتے ہیں' مردہ قوم کو بھی' اُس نے کہا ہے کہ ہم اس

لیے زندہ کیا کرتے ہیں کہ وہ ہمارے ساتھ رفاقت میں مل کر کاروبار کرے اور اس کے بعد اس میں وہ صرف اپنی محنت لے اور جتنا ہمارا حصہ ہے وہ ہمارے لیے الگ کر دے۔

خیرات کے طور پر کچھ دینے اور کچھ لینے کا تصور انسانی نفسیات کو سخت گیر اور پژمردہ کر دیتا ہے

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (51:19) اس میں ہر اس شخص کا حق ہوتا ہے جس کے پاس اس کی ضرورت سے کم ہو یا جو بالکل کما سکنے کے قابل نہ ہو' یہ قرآن کی رو سے خیرات نہیں ہے۔ دوسری جگہ (70:25) میں بھی ہے اور نبی اکرم ﷺ کی بھی ایک بڑی درخشندہ حدیث ہے جس میں حضور ﷺ نے فرمایا کہ خیرات سے تو دینے والا کا دل پتھر ہو جاتا ہے' لینے والا تذلیل محسوس کرتا ہے' اس لیے یہ بات نہیں ہے کہ ان کو بطور خیرات کے دو۔ یہ تو حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (51:19) ہے' یہ ان کا' حق ہے لیکن یہ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ (70:25) ہے' ان کا یہ Right (حق) ان کا یہ Recognized (تسلیم شدہ) ہے۔ یہ تم سے As of Right (بطور حق) لیں گے۔ Right (حق) کیوں لیں گے؟ اس لیے کہ ہمارا حصہ ہے' تم اپنے ہاں سے دو تو کچھ کہہ بھی دو کہ ہم نے ان کو کچھ دیا تو احسان کیا۔ وہ کہنے لگے کہ تمہارا یہ تھا ہی نہیں' یہ ہمارے Behalf (جانب) پہ تمہارے پاس آئے ہیں تو جو ہمارا Right (حق) ہے وہ ان کو دیدیجیے۔ یہ ہے ربوبیت' عزیزانِ من! اور اسی لیے اُس نے یہ کہا ہے کہ اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ (2:267) جو دینا ہے' تم نے جو انفاق کرنا ہے' جو پاکیزہ رزق ہے' اُس میں سے دو' رزقِ حرام میں سے نہ دو۔

انسانی زندگی کے نظم و نسق کو ترتیب دینے کے لیے خارجی کائنات کی مثال پیش کرنے کی وجہ

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں کہا ہے کہ وَاٰيَةٌ لَّهُمُ الَّيْلُ نَسْلَخُ مِنْهُ النَّهَارَ فَاِذَا هُمْ مُّظْلِمُوْنَ - وَالشَّمْسُ تَجْرِىْ (36:37.38)۔ یہاں زمین کی باتیں کرنے کے بعد خارجی کائنات میں جس طرح اس کا نظم و نسق چلتا ہے اس کو بطور شہادت پیش کرتا ہے کہ ہمارے قانون کے اتباع سے یہ نظام کس حسن و خوبی سے چلتا ہے۔ وہ یہ چیزیں اس لیے نہیں بتاتا کہ اُس نے فلکیات یا ارضیات وغیرہ کا نصاب مقرر کیا ہوا ہے یا سائنس کی کلاس کو سبق دے رہا ہے۔ وہ یہ شواہد پیش کر کے آخر میں پھر وہیں جاتا ہے کہ یہ تم اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہو کہ ہمارے قانون کی اطاعت میں جو نظام چلتا ہے' وہ کس حسن و خوبی سے چلتا ہے۔ تم اپنے ہاں بھی ہمارے قانون کے مطابق اگر یہ نظام چلاؤ تو اسی طرح سے وہ نتیجہ خیز ہو جائے گا لیکن جو چیزیں اُس نے کہی ہیں' یہ فلکیات کے متعلق ابھی یہاں آتا ہے' آسمانی کرّوں کے متعلق' فضا کے متعلق' چودہ سو سال پہلے کہا ہے۔ میں ابھی یہ عرض کرونگا کہ یہی وہ آیتیں ہیں' یہی وہ حقائق ہیں' جو قرآن نے کہے تھے' جو خود قرآن کے اس دعوے کی شہادت ہے کہ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہو سکتا۔

قرآنِ حکیم کے کائناتی حقائق کو سمجھنے کے سلسلہ میں اہل یورپ کی ریسرچ نے ہمارے لیے بڑی آسانی پیدا کردی ہے

عزیزانِ من! اب ہمارا یہ دور اور ہم اُس باب میں خوش قسمت بھی ہیں کہ پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانوں سے' یورپ کے ملحد اور بے دین جنہیں آپ کہتے ہیں' مسلم بھی نہیں ہیں' وہ تحقیق کر رہے ہیں' Independently (آزادنہ) تحقیق کر رہے ہیں اور آزادانہ تحقیق کے بعد اس نتیجے پہ پہنچ رہے ہیں کہ یہ وہ بات ہے جو چودہ سو سال پہلے قرآن نے کہی تھی۔ کہا ہے کہ **وَالشَّمْسُ تَجْرِیْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا ذٰلِکَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ . وَالْقَمَرَ قَدَّرْنٰهُ مَنَازِلَ حَتّٰی عَادَ کَالْعُرْجُوْنِ الْقَدِیْمِ. لاَ الشَّمْسُ یَنْبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِکَ الْقَمَرَ وَلاَ الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَکُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ(36:38.40)**۔ عام مفہوم کے اعتبار سے یہ شمس اپنے نظام کو لیے ہوئے ہے۔ ایک تو اس کی حرکتِ دوری ہے' خود یوں گھوم رہا ہے' ایک حرکت ہم یہ بھی دیکھ رہے ہیں کہ طلوع ہوتا ہے اور غروب بھی ہوتا ہے۔ قرآن نے اس کے لیے کہا کہ اس کا ایک مستقر ہے۔ مستقر ہوتا ہے کہ کوئی متحرک شے جو کہیں جا کر ٹھہر جائے' رک جائے' ساکن ہو جائے' تو اس مقام کو اس کا مستقر کہتے ہیں۔

چودہ سو سال پہلے کائناتی کرّوں کے متعلق قرآنِ حکیم کا ارشاد اور لفظ تسبیح کا مفہوم

اب یہ جو چیز تھی کہ چودہ سو سال پہلے تو یہی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا کہ یہ زمین بھی گردش کرتی ہے یا ان کی دوری گردش بھی ہے۔ اُس زمانے میں زمین کے متعلق تو یہی چیز تھی کہ یہ ساکن ہے' سورج اس کے گرد گردش کرتا ہے۔ کسی کرّے کے متعلق اُس زمانے کے سائنسدانوں کے ذہن میں بھی نہیں تھا۔ سورج کے متعلق یہ کہ اس کا ایک مستقر ہے جس کی طرف یہ جا رہا ہے' ایک چیز یہ ذہن میں رکھیے۔ یہ چاند کی منازل تو ہمارے سامنے ہیں۔ پہلی تاریخ کا چاند آہستہ آہستہ ارتقائی منازل طے کرتا ہے' پھر ایک عروج پہ پہنچنے کے بعد وہ انحطاط کی طرف آتا ہے۔ آخر میں وہ کہتے ہیں کہ وہ پھر جیسے ایک کھجور کی سوکھی ہوئی' ٹیڑھی سی ٹہنی ہوتی ہے' ایسا رہ جاتا ہے۔ کہا ہے کہ **لاَ الشَّمْسُ یَنْبَغِیْ لَهَآ اَنْ تُدْرِکَ الْقَمَرَ وَلاَ الَّیْلُ سَابِقُ النَّهَارِ(36:40)** کبھی ایسا نہیں ہوتا ہے کہ سورج بھاگتا ہوا چاند سے آگے چلا جائے' کبھی چاند بھاگتا ہوا سورج سے آگے چلا جائے یا ان کے اندر کوئی ریس لگی ہوئی ہو۔ اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ قرآن کریم نے تو کہتا ہے کہ **وَکُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ(36:40)** یہ **یَسْبَحُوْنَ** ایک لفظ ہے۔ یہاں سے میں آؤنگا۔ مستقر کی طرف بعد میں آتا ہوں۔ کہا ہے کہ **وَکُلٌّ فِیْ فَلَکٍ یَّسْبَحُوْنَ(36:40)**۔ چودہ سو سال پہلے قرآن کہہ رہا ہے کہ ان میں سے ہر کرّہ اپنے اپنے Orbit (مدار) کے اندر ہے' جس میں اُس نے چلنا ہے۔ یہاں **یَسْبَحُوْنَ** کا لفظ آیا ہے۔

ہمارے ہاں تو سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (57:1) کی تسبیح کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں ترجمہ یہ ہے کہ یہ تسبیح کرتے ہیں۔ بہرحال غنیمت ہے کہ یہ تسبیح کرتے ہیں کہتے ہیں۔ ''اسی تے تسبیح پھیردے دیکھے ہیگے نیں[1]''۔ سبح کے معنی ہوتا ہے'' تیرنا''۔ کہا ہے کہ یہ اپنے اپنے مدار کے اندر تیر رہے ہیں' فضا کے اندر تیر رہے ہیں۔ یہی کوئی چھوٹی بات نہیں لیکن اس سے بھی بہت بڑی بات ہے' عزیزانِ من! جو اس دور میں آ کر ان لوگوں کے سامنے آ رہی ہے کہ ہماری آنکھیں اس سے کھل جائیں۔

سائنسی انکشافات کے سلسلہ میں ڈاکٹر بوکائے کی طرف سے لکھی جانے والی کتاب کا تعارف

آپ کو یاد ہے کہ میں پیرس کے اُس ڈاکٹر کا اکثر ذکر کیا کرتا ہوں۔ اس کا نام تو وہ لکھتے ہیں Maurice Bucaille (1911-1989) لیکن اس کا Pronounciation (تلفظ) وہ 'بوکائے' پڑھتے ہیں' یہ فرانسیسی لفظ ہے۔ مجھے بھی پتہ نہیں تھا۔ اِنہوں نے عربی میں اپنی کتاب کا ترجمہ شائع کیا ہے' وہ میرے پاس آئی ہے' یہ ترجمہ بڑا خوبصورت ہے۔ اس کی کتاب ہے "The Bible, The Qur'an & Science"۔ اس سے پہلے میں اس کا تعارف کئی بار کرا چکا ہوں۔ یہ عجیب وغریب کتاب ہے۔ یہ بوکائے مسلمان نہیں ہے' عیسائی ہے۔ اُس نے پہلے آزادانہ بائبل کے اندر جو خارجی کائنات اور افلاکیات کے متعلق جو کچھ آیا ہے' اس کا مطالعہ کیا ہے اور آج کی سائنس جن نتائج پہ پہنچی ہے' اُس نے جو انکشافات (Discoveries) کیے ہیں' ان کی روشنی میں' پہلے اس نے بائبل کے یہ جتنے بھی مقامات ہیں' ایک ایک لے کر کہا ہے کہ یہ سب غلط ہیں۔ بائبل کے اندر دیئے ہوئے جو'' حقائق'' ہیں' وہ عصرِ حاضر کے علمی انکشافات کے تحت اس نتیجے پہ پہنچاتے ہیں کہ یہ خدا کا کلام نہیں ہوسکتا کیونکہ جو انکشافات ہیں' وہ علمی سائنس کے ہیں اور بائبل کو Contradict (ردّ) کر رہے ہیں۔ اُس نے کہا ہے کہ پھر میں نے سوچا کہ ایک بہت بڑا مذہب اسلام بھی ہے' ان کے ہاں بھی تو دیکھنا چاہیے' ان کے ہاں بھی قرآن ایک کتاب ہے جسے یہ آسمانی کہتے ہیں' ذرا دیکھو اس کے اندر کیا کہا ہے۔ میں اس وقت اس تفصیل میں نہیں جاتا' پہلے پیش کر چکا ہوں کہ اس کے سمجھنے کے لیے اس شخص نے خود کیا کیا' چند لفظوں میں یہ سمجھیے۔ قرآنِ کریم کی یہ کتاب لی۔ اُس نے کہا کہ ترجموں سے بات نہیں بن سکتی ہے' ترجمے تو ان لوگوں کے خیالات ہونگے جنہوں نے ترجمے کیے ہونگے۔ یہ اوریجنل ہونی چاہیے لہٰذا اُس نے اوریجنل عربی سیکھنی چاہی۔ پھر اُس نے کہا کہ یہ جو عربی جدیدہ ہے' یہ قرآن کے نزول کے زمانے میں نہیں تھی' عربی کا جو مفہوم یا جو عربی تھی وہ عربی سیکھنی چاہیے۔ وہ پھر عرب گیا' ان بدوؤں کے اندر جا کر رہا' اس

---

[1] ہم نے تو تسبیح پھیرتے دیکھے ہیں۔

نے یہ جو عربی جدید تھی کتابوں سے نہیں سیکھی یا پڑھی' ان بدوؤں کے ہاں اور ہمارے ہاں بھی یہ جو تہذیب سے دور بستے ہیں' ان کے ہاں زبان محفوظ ہوتی ہے' ان سے جا کر اس نے زمانۂ نزولِ قرآن کی جو عربی تھی وہ سیکھی۔ پھر اس کے بعد اس نے کہا کہ اس کا بھی کیا ثبوت ہے کہ یہ وہی قرآن ہے جو رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا' بعد کے ان کے ہاں کے علما یا سائنسدانوں نے یہ کچھ نہیں بنا دیا۔ اُس نے پھر قرآن کے متعلق ریسرچ کی کہ یہ وہی ہے یا نہیں؟ اسے کہتے ہیں عالم (Scholar)۔ پھر اُس نے کہا کہ قرآن میں تو یہ بکھرے ہوئے ہیں' یہ سارے حقائق مرتب شکل میں تو نہیں ہیں' Classify (تبویب) تو نہیں ہوئے کہ میں ایک چیک کرلوں اور اس کے نیچے سب کچھ آجائے تو اس کی تو تبویب ہونی چاہیے۔ یہ وہی ہے جو میں نے اپنے ہاں تبویب کی ہے کہ ایک موضوع کے اوپر جتنی آیتیں قرآن کے اندر' جس مقام پہ آئی ہیں' ان سب کو اکٹھا کیا ہے۔ اس نے بھی یہی کہا کہ ان سب کو اکٹھا کرنا چاہیے' پھر اُس نے یہ کیا۔

ڈاکٹر مورس بوکائے کی نظر میں لفظ ''سبح'' کی ریسرچ اور اس کا مفہوم

خارجی کائنات' بالخصوص فلکیات کے متعلق' اُس نے جو یہ آیتیں اکٹھی کیں' وہ تو بہت ہیں' یہ جو میرے سامنے آیت آئی ہے اسے لیا۔ اس میں لفظ سبح آیا ہے عزیزانِ من! یہ لوگ ہیں جو قرآن کو سمجھتے ہیں۔ کہا کہ ''حرکت میں رہنا'' کے لیے تو عربی زبان میں بہت سے الفاظ تھے' خاص طور پہ قرآن نے یہ لفظ کیوں چنا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ قرآن کا ایجاز یہ بھی ہے کہ وہ عربی زبان کے سینکڑوں ہزاروں الفاظ میں سے ایک کا انتخاب کرتا ہے۔ اُس نے کہا کہ ''اس حرکت کے لیے'' اُس نے سبح کا لفظ کیوں استعمال کیا ہے۔ سنیے' عزیزانِ من! وہ لکھتا ہے [1] کہ

The Arabic word refering to a movement with a self-propelled motion is the verb "Sabaha" (yasbahuna in the text of the two verses). All the senses of the verb imply a movement that is associated with a motion that comes from the body in Question (P.161)

ڈاکٹر بوکائے کا بارگاہِ رسالت میں نذرانۂ عقیدت اور قرآن حکیم کی عظمت کا اعتراف

کہتا ہے ایک تو حرکت وہ ہوتی ہے کہ باہر سے کسی کو Move (متحرک) کیا جائے جیسے ہمارے ہاں کے انجنوں کی حرکت ہوتی ہے'

---

[1] تمام انگریزی اقتباسات کے صفحات درج ذیل کتاب سے لیے گئے ہیں:

Bucaille, Maurice (1998). The Bible, The Qur'an And Science. Lahore: Islamic Book Service.

باہر کی قوت ان کو Movement (حرکت) میں دیتی ہے۔ کہا ہے کہ ایک موومنٹ وہ ہے جو Moved Body ہے' متحرک شے ہے' اس کے اندر ایک توانائی ہو' اور وہ جو اس کے اندر کی توانائی ہے' وہ اس کو متحرک کر رہی ہو۔ عربوں کے ہاں ''سبح'' کا لفظ اس کے لیے بولا جاتا ہے' ''تیراک'' کے لیے بولا جاتا ہے اس لیے وہ کہتے ہیں کہ ''تیرنے والا'' کسی باہر کی خارجی طاقت کے ذریعے سے حرکت میں نہیں ہوتا' اس کے اپنے اندر کی توانائی ہوتی ہے جو اس کو حرکت میں رکھتی ہے۔ کہا ہے کہ یہ جو شمس اور قمر ہے' یہ کرّے جتنے بھی آسمان کے ہیں' یہ مصروفِ گردش ہیں تو کوئی باہر سے ایسی چیز نہیں ہے جو ان کو گھما رہی ہے' ان کے اندر اتنی توانائی اور اتنی قوت ہے جو اس قوت کی بنا پہ وہ خود گھوم رہے ہیں۔ اس قسم کی حرکت جو حرکت کرنے والی کی اپنی توانائی کے زور پر حرکت ہو' اس کے لیے عربی زبان میں ''سبح'' کا لفظ آتا ہے اور قرآن نے ان کے لیے جو ''سبح'' کہا ہے' آج سائنس کے انکشافات یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ اپنی اندرونی توانائی کے زور پر محوِ گردش ہیں۔ کہتا یہ ہے کہ جو ''سبح'' کے معنی ہیں' سنیے صاحب! وہ وجد میں آجاتا ہے اور بے اختیار بارگاہِ محمدی ﷺ کے اوپر سجدہ کر لیتا ہے۔

Its appear therefore that a verbal nuance in the Qur'an refers to the Sun and Moon's all motion. These motions of the two celestial bodies are confirmed by the data of modern science. (P.162)

کہا کہ یہ چیز نظر آئی جو قرآن نے سبح کا کہا کہ یہ اپنی اندرونی طاقت کے زور پر محوِ گردش ہیں اور آج سائنس کے انکشافات نے اس چیز کو ثابت کر دیا کہ بیرونی کوئی قوت نہیں ہے جو ان کو محوِ گردش رکھ رہی ہے۔ یہ ان کے اپنے اندر کی چیز ہے اور کہا کہ قرآن کے اس لفظ کی جو لطافت اور گہرائی ہے' وہ غور کے قابل ہے۔ کہا کہ

it is inconceivable that a man living in the Seventh century A.D.however knowledgeable he might has been in his day (and this were certainly not true in Muhammad's case) could have imagined them. (P.162)

مقامِ نبوت کے متعلق بوکائے کہتا ہے کہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ایک شخص جو ساتویں صدی عیسویں میں ہو اور وہ بھی ایسا شخص محمد ﷺ جیسا' جو لکھا پڑھا بھی نہ ہو' اُس زمانے کا تو بڑے سے بڑا عالم بھی اس کو Conceive نہیں کر سکتا تھا' تصور نہیں کر سکتا تھا کہ یہ کرّے اس طرح سے محوِ گردش ہیں چہ جائیکہ محمد ﷺ یہ چیز Conceive کر سکتا۔ یہ کسی انسان کے تصور میں آ نہیں سکتا تھا اس لیے یہ انسان کا کلام نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ یہ کہہ رہا ہے۔ اللہ اکبر۔ کہتا ہے کہ اُس دور میں کوئی اچھے سے اچھا عالم سائنسدان

بھی یہ بات تصور میں نہیں لاسکتا تھا چہ جائیکہ وہ نبی اکرم ﷺ کہ جو لکھے پڑھے بھی نہیں تھے' وہ کہہ رہا ہے' وہ یہ تصور کر لیتے۔ آج سائنس اس کی شہادت دیتی چلی جارہی ہے۔ ''مستقر'' کے متعلق وہ کہتا ہے کہ چاند اپنے ایک مستقر کی طرف جارہا ہے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ ایک تو یہ سورج ہے کہ صبح طلوع ہوتا ہے' وہاں چلا جاتا ہے ہم تو زیادہ سے زیادہ یہی کہہ سکتے تھے' جسے ہم مغرب کہتے ہیں' وہ اس کا مستقر ہے حالانکہ یہ تو ہمارا فریب نگاہ ہے۔ وہ وہاں جا کر رک تو نہیں جاتا' وہ تو مغرب ہماری نگاہ کی رو سے ہے' جو نیچے والے ہیں' امریکہ والے' وہ تو ان کی مشرق ہوتی ہے اسی لیے تو قرآن نے مغربین اور مشرقین کہا ہے۔ اُس نے مستقر کہا ہے کہ جہاں کوئی متحرک شے جا کر رک جائے' ساکن ہو جائے۔ یہ کہتا ہے کہ

Settled place is the translation of the word 'Mustaqarr' and there can be no doubt that the idea of an exact place is attatched to it. (P.165)

مستقر کے تو معنی یہ ہیں' وہ کہہ رہا ہے کہ چلنے والی متحرک شے وہاں جو اس کی **Settled place** ہے وہاں جا کر اس نے رک جانا ہے' اُس نے **Settle** ہو جانا ہے اور اس کے بعد کہتا ہے کہ

Modern Astronomy has been able to locate it exactly and has even given it a name ..... (P.166)

آج کے سائنس کے انکشافات' فلکیات کے انکشافات' نے وہ جو شمس کا مستقر ہے کہتا ہے' اس کو اُنہوں نے تلاش کر لیا ہے اُنہوں نے اس کا ایک نام بھی رکھ دیا ہے اور وہ نام ہے **"The Solar Apex"**

..... the solar system is indeed evolving in space towards a point situated in the Constellation of Hercules (alpha lyrae) whose exact location is firmly established; it is moving at a speed already ascertained at something in the region of 12 miles per second. All these Astronomical data deserve to be mentioned in relation to the two verses from the Qur'an, since it is possible to state that they appear to agree perfectly with modern scientific data. (P.166)

قرآن کی آیات کے متعلق وہ کہتا ہے کہ آج کی سائنس کے جو انکشافات ہیں' اس کی صداقت کی شہادت بہم پہنچا رہے ہیں' وہ بالکل اس کے مطابق ہیں جو قرآن نے کہا ہے۔ وہ یہ چیزیں کہہ رہا ہے کہ ساتویں صدی کے اندر بتایئے کون یہ چیزیں کہہ سکتا تھا' کس کے تصور میں بھی یہ چیز آسکتی تھی!! آگے جا کر اُس نے کہا ہے کہ ٹھیک ہے کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ جو اچھے اچھے علما ہیں'

اچھے اچھے سائنسدان بھی کچھ اندازہ یا قیاس کی بات کر سکتے ہیں' ان کی بات بھی صحیح نکل سکتی ہے' نکل آتی بھی ہے۔ لیکن

There can be no doubt that this verse indicates the possibility men will one day achiee what we today call (perhaps rather improperly) the conquest of space. (P.168)

خلا کی یا کائنات کی تسخیر کے متعلق یہ جو آیتیں ہیں' یہ نوٹ کر رہے ہیں اور قرآن نے **وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا (45:13)** کہا ہوا ہے' یہ سب کچھ ہے۔ یہ ہے وہ بات جو اس نے کہی ہے کہ

Here again, it is defficult not to be impressed, when comparing the text of the Qur'an to the data of Modern science, by statements that simply can not be ascribed to the thought of a man who lived more than fourteen centuries ago. (P.169)

سائنس کے جتنے انکشافات آ رہے ہیں ان میں سے ہر ایک ہمیں اس نتیجے پہ پہنچاتا ہے کہ ساتویں صدی میں جو شخص پیدا ہوا تھا اُس کے تصور میں بھی یہ باتیں نہیں آ سکتی تھیں جو قرآن کے اندر ہیں اس لیے یہ قرآن محمد ﷺ کا کلام نہیں ہو سکتا۔ یہ ہیں وہ لوگ' عزیزانِ من! جو ان حقائق تک پہنچتے ہیں۔ ہم نے تو تسبیح کر کے زیادہ سے زیادہ کہہ دیا' اگر کسی نے سبح کے معنی کسی طرح سے بھاگنے دوڑنے والا لے بھی لیے تو یہ جو بات تھی کہ اس قسم کی حرکت کہ جو اس کی اپنی حرکت ہو' باہر سے اسے متحرک نہ کر رہی ہو' وہ کہتا ہے کہ یہ جو فرق کرنا تھا' یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں تھی کہ ساتویں صدی عیسوی کے اندر وہ یہ کرتا۔ آج کی سائنس ہمیں اس نتیجے پہ پہنچا رہی ہے کہ یہ حرکات کس قسم کی ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ **وَكُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ(36:40)** ہر کرّہ' اپنے اپنے دائرے (Orbit) میں اپنی اپنی رفتار سے ٹھیک اپنے اپنے راستے پر تیرتا چلا جاتا ہے اور آگے کہا کہ **وَالشَّمْسُ تَجْرِيْ لِمُسْتَقَرٍّ لَّهَا (36:38)** اور سورج کس طرح اپنے مستقر کی طرف رواں دواں چلا جا رہا ہے۔ تو بات تو وہ کہہ رہا ہے کہ ہمارا نظام کس قدر Perfectly (مکمل طور پر) چل رہا ہے لیکن اس مقصد کے لیے کہہ رہا ہے کہ تم بھی اپنے ہاں اگر ہمارے قوانین کے تابع نظام قائم کر لو' تو وہ اسی قسم کے نتائج پیدا کرے گا۔ اور یہ جو چیز ہے کہ یہ نتائج اُس زمانے میں پیدا کیے' کائنات کے بھی جتنے مظاہر ہیں وہ کسی خاص دور میں نہیں پیدا کیے' وہ ہمیشہ کے لیے' ابدی طور پر' وہ پیدا کیے چلے جاتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اسی طرح سے یہ تمہارے ہاں جو نظام ہے اسی طرح سے نتائج پیدا کرے گا اور ان شہادات سے یہ بات پتہ چلی۔ وہ یورپ کے لوگ' میں نے کہا ہے کہ غیر

مسلم، جنہیں ہم ملحد کافر، بے دین کہہ کر پھٹکار دیتے ہیں، ان کی کیفیت یہ ہے کہ آزادانہ تحقیق کرتے ہیں اور وہ اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ یہ باتیں ساتویں صدی عیسوی میں کوئی انسان تصور میں بھی نہیں لاسکتا تھا۔ یہ لا ریب ہے کہ یہ انسان سے بالاتر کوئی سرچشمہ علم ہے، جہاں سے یہ چیزیں ملی تھیں۔ اور وہ کہتا ہے کہ میں تو قرآن کے منجانب اللہ ہونے کے اس بنا کے اوپر اس نتیجے پہ پہنچا ہوں کہ یہ انسان سے بالاتر سرچشمہ علم ہے، جسے محمد ﷺ نے وحی کہہ پکارا ہے اور وہ اپنے اس دعوے میں بالکل سچا تھا۔ وہ شخص یہ کچھ کہہ رہا ہے۔

تحقیقاتِ سماوی کے بعد ارض کی تحقیق کے متعلق انکشافات

یہ ہے، عزیزانِ من! قرآن کی وہ آیتیں، جو سورۃ یٰسٓ کے اندر آئیں۔ اس کے بعد پھر وہ زمین کے اوپر آ گیا ہے۔ کہا ہے کہ **وَاٰيَةٌ لَّـهُـمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ . وَخَلَقْنَا لَهُمْ مِّنْ مِّثْلِهٖ مَا يَرْكَبُوْنَ . وَاِنْ نَّشَاْ نُغْرِقْهُمْ فَلَا صَرِيْخَ لَهُمْ وَلَا هُمْ يُنْقَذُوْنَ (36:41.43)** آسمان کی باتیں تو چھوڑیئے، زمین کی طرف آجایئے۔ دیکھتے نہیں ہیں کہ یہ کشتی، یہ جہاز، اتنے اتنے بڑے لوہے کے جہاز ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا تھا کہ یہ ایک سوئی بھی اگر پانی میں پھینک دی جائے، وہ ڈوب جاتی ہے، تیر نہیں سکتی مگر یہ سینکڑوں ہزاروں ٹن کا لوہے کا جہاز اُس کے اندر، پھر اتنا وزن اور لدا ہوا، تیرتا چلا جاتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ بتاؤ تو سہی یہ کس طرح بط کی طرح سینۂ بحر کے اوپر تیرتا ہوا چلا جاتا ہے، کہا ہے ایک قانون ہے کہ پانی کے اتنے وزن میں جو Space (مکاں) ہوتا ہے اُس کے وزن کے برابر یہ چیز تیرتی ہے۔ یہ قانون ہے اور وہ جانتے ہیں کہ جتنے جہاز ران ہیں، یہ میرین والے لوگ ہیں، اُس سے ذرا سا بھی زیادہ ہو جاتا ہے تو وہ ڈوب جاتا ہے۔ اُس سطح کے اوپر رہتا ہے تو وہ موجوں کی طغیانیاں اور تلاطم خیزیاں بھی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتیں۔

انسانی معاشرے میں خارجی تبدیلی کا تمام تر دارومدار انسان کی نفسیاتی تبدیلی پر منحصر ہوتا ہے

اس لیے وہ کہتا ہے کہ اگر اس قانون کے مطابق رہو تو خارجی مخالفتیں، خارجی طوفان اور سیلاب، تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔ لیکن اگر تمہارے اپنے اندر یہ تبدیلی نہ آئے تو پھر تم ان تلاطموں سے بچ نہیں سکتے۔ یہ یاد رکھو۔ اس لیے کہ اس کا اصول یہ ہے کہ کوئی قوم بھی اپنی خارجی حالت میں تبدیلی نہیں پیدا کرسکتی تاوقتیکہ اس کے اپنے اندر کی دنیا کے اندر تبدیلی پیدا نہ ہو۔ یہ جن چیزوں کو بھی ہم اپنے ہاں معاشرے کی اصلاح کے لیے، صحیح نظام قائم کرنے کے لیے، کہتے ہیں یہ سب خارج کے اندر کچھ تبدیلیاں ہیں جن کو پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے، جو اندر کی تبدیلی ہے، وہ ہے جو خارج میں تبدیلی پیدا کرتی ہے۔ خارجی تبدیلی اس اندر کی تبدیلی کا تو مظہر ہوتی ہے۔ ذہنیت بدلنی چاہیے، قلب و دماغ کے تصورات بدلنے چاہئیں، نظریات بدلنے چاہئیں، انسان

کے کردار، سیرت، ہیئت کے اندر ایک تبدیلی آنی چاہیے پھر اُس کا مظہر ہوتا ہے جو باہر کی تبدیلی ہوتی ہے۔ اندر کی تبدیلی کے متعلق، آپ اندازہ لگائیے کہ جسے میں نے ابھی عرض کیا تھا، قرآن نے ابتدا کی تھی کہ مجرم کے ساتھ یہ برتاؤ کیا جائے، جو خدا نے کہا ہے، تو پھر دیکھو کہ اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔

انسانی معاشرے کی استقامت کے لیے دو سنہرے ابدی اصول: قانون کا احترام اور قانون نافذ کرنے والے کی سیرت پر اعتماد

عزیزانِ من! قانون کا احترام اور قانون نافذ کرنے والے کی سیرت کی بنا پہ اس کا احترام، یہ دو چیزیں ہیں۔ اُس پہ کیفیت کیا پیدا ہوتی ہے؟ اس کے لیے کہا کہ **فَلَا وَ رَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَ یُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا(4:65)** ۔ کہتے ہیں کہ قرآن کا نظامِ عدل کیا ہے۔ بات شروع کرتا ہے کہ خدا کہتا ہے کہ تیرا خدا اس حقیقت پہ شاہد ہے یا اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ یہ لوگ کبھی مومن نہیں کہلا سکتے تاوقتیکہ اپنے ہر اختلافی معاملہ میں تیری طرف رجوع نہ کریں اور اس کے بعد جو فیصلہ تُو دے، یہ نہیں ہے کہ پھر اُس کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں، یہ بھی ایک چیز ہے کہ مان لیا، وہاں تو یہ ہے کہ اُس فیصلے کے خلاف ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی گرانی محسوس نہ ہو۔ جرائم کا خاتمہ، عزیزانِ من! اس طرح سے ہوتا ہے۔ یہ کیا بات کہی کہ یہ ایماندار نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ اُس فیصلے کے خلاف گرانی تک محسوس نہ کریں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جیسے انسان کی طبیعت کے خلاف بات کہی ہے۔ گرانی کیوں محسوس نہ کرے؟ اُس کے خلاف فیصلہ جا رہا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ اس قانون کے خدا کی طرف سے ہونے کی صداقت پر وہ ایمان لایا ہوا ہے، یہ میرا ایمان ہے کہ یہ انسان کا قانون نہیں، خدا کا قانون ہے اور میں نے اس قانون کو بطیّب خاطر تسلیم کیا ہوا ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے۔ دوسری چیز یہ ہے کہ وہ اس قانون کے مطابق جو فیصلہ دے رہا ہے، اس کے متعلق میرا ایمان ہے کہ اس کی سیرت اتنی بلند ہے کہ وہ نہ کسی کی حمایت کرتا ہے، نہ کسی کی مخالفت کرتا ہے، صحیح عدل کے مطابق قانون کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ اس کا احترام اس کے دل میں ہے، قانون کے اوپر ایمان لایا ہوا ہے، قانون نافذ کرنے والے کی سیرت و کردار کے اوپر اس کا ایمان ہے اور جب اس طرح سے فیصلہ ہوگا تو دل میں گرانی کیسے آئے گی صاحب! تو جن فیصلوں کے خلاف دل میں گرانی نہیں آتی ہے، اسے کہتے ہیں تغیرِ نفس۔ یہ ذہنیت کی تبدیلی ہے۔

تغیرِ نفس دراصل انسانی ذہنیت کی تبدیلی کا دوسرا نام ہے اور یہ چیز کرھاً پیدا نہیں ہوتی

معاشرے کے اندر، افرادِ معاشرہ کے اندر، یہ تبدیلی پیدا کی جائے گی کہ وہ قانون کے متعلق سمجھیں کہ خدا کا قانون ہے جس پہ

میں ایمان لایا ہوا ہوں' قانون نافذ کرنے والے جو ہیں' آپ کے ہاں جو عدل کا نظام ہے' اُس کے متعلق ان کا ایمان ہو کہ یہ نہ کسی کی رو رعایت کریں گے' نہ کسی کے یونہی خلاف جائیں گے' ٹھیک ٹھیک قانون کے مطابق فیصلہ کریں گے' اس سے اس کے دل میں قانون کا بھی احترام باقی رہتا ہے' قانون نافذ کرنے والے کا بھی احترام ہوتا ہے اور اس فیصلے کے خلاف وہ دل میں گرانی تک محسوس نہیں کرتا۔ یہ ہے جو قرآن کہتا ہے کہ ہم نے کائنات کی چیزوں سے کہا کہ یہ قانون ہے' تم اس کی اطاعت کرتے ہو' تمہیں کرنا پڑے گی' طوعاً و کرھاً کرنا پڑے گی طوعاً یعنی بطیّب خاطر' کرھاً ایسا نہ کرو گے' تو مجبوراً تم سے کرائی جائے گی۔ اُنہوں نے کہا کہ صاحب! کرھاً کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' ہم اس کا طوعاً اتباع کریں گے' بطیّب خاطر اس کا اتباع کریں گے۔ اسی لیے اُس نے کہا ہے کہ **لَآ اِكْـرَاهَ فِـي الـدِّيْنِ(2:256)** کرھاً سے ہی اکراہ لفظ ہے کہ مار مار کر اگر تم یہ چیز کسی سے منواتے ہو تو ٹھیک ہے۔ قوت کے زور کے اوپر تم کسی کو جھکا سکتے ہو' اس کے دل کی گہرائیوں میں یہ بات کہ اُس کے خلاف گرانی محسوس نہ ہو' نہیں لا سکتے۔ گرانی کی کیا بات وہ تو کھڑے ہوئے گالیاں دے رہا ہوتا ہے۔ یہ تبدیلی جو اندر کی ہے عزیزانِ من! یہ ہے جو بطیّب خاطر طوعاً معاشرے کو صحیح راستے کے اوپر چلاتی ہے۔ اگر ہم نے یہ چیز نہیں کی ہوئی تو قرآن کہتا ہے کہ بجائے اس کے کہ ان کے خلاف تمہارے دل میں نفرت کے جذبات پیدا ہوں' ہمدردی کے جذبات پیدا کرو' کچھ سوچو تو تمہارے ہی اندر کوئی کمی تو نہیں رہ گئی جس کی وجہ سے تم ان کی اصلاح نہیں کر سکے۔ اپنی طرف ذرا غور کر کے دیکھو۔ اصلاح کی ضرورت تھی' ہمدردی کی ضرورت تھی' ان کے ساتھ یہ کیفیت پیدا کرنے کی ضرورت تھی کہ قانون کا احترام' قانون نافذ کرنے والے کی سیرت کا احترام' ان کے دل کی گہرائیوں کے اندر سے ابھرے۔ اُس نے کہا ہے کہ پھر تم دیکھو کہ کس طرح سے اصلاح ہوتی ہے!

عزیزانِ من! ہم سورۃ یٰسٓ کی آیت 44 تک آ گئے' 45 ویں آیت سے آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

پانچواں باب: سورۃ یٰسٓ (آیات 60 تا 73)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من! آج جولائی 1980ء کی 11 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ یٰسٓ کی آیت 60 سے ہو رہا ہے: (36:60)۔

سابقہ آیات میں یہ بتایا جا رہا تھا کہ جو لوگ اقدارِ خداوندی سے سرکشی برت کر اپنے ہی جذبات کو خدا بنا لیتے ہیں ان کا انجام کیا ہوتا ہے۔

ہمارے ہاں یومِ الست کی نوعیت

آج کی آیت یہاں سے شروع ہوتی ہے کہ اَلَمْ اَعْهَدْ اِلَيْكُمْ يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اَنْ لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطٰنَ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ. وَّاَنِ اعْبُدُوْنِيْ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ (36:60-61)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ہے کہ اے بنی آدم! ہم نے تم سے یہ عہد نہیں لیا تھا

کہ تم نے شیطان کی پرستش‘ عبادت نہیں کرنی‘ یہ تمہارا دشمن ہے‘ میری عبادت کرو؟ یہ عہد لیا گیا‘ اسے میثاق بھی کہتے ہیں۔ تمام انسانوں سے اس کا عہد لیا گیا کہ صرف خدا کی پرستش کی جائے گی۔ عبادت کا ترجمہ پرستش کیا اور کہا کہ شیطان کی پرستش نہیں کی جائے گی۔ سوال پیدا ہوا کہ بہرحال انسان ہیں‘ ہم آپ سب اُس میں شامل ہیں‘ تو ہم سے کب یہ عہد لیا تھا‘ اب اس سے چلی بجھیں۔ آپ کو پتہ ہے کہ یوم الست کہا ہے یا عہدِ الست ہمارے ہاں چلتا ہے۔ یہ اربابِ شریعت میں بھی ہے اور جو اربابِ طریقت ہیں‘ وہ تو پوچھیے نہیں کہ اس میں کہاں تک گئے ہیں۔ کہا یہ گیا کہ تمام روحیں‘ جو قیامت تک دنیا میں آنے والی تھیں‘ وہ پہلے پیدا کی گئیں اور ان سے خدا نے یہ عہد لیا کہ تم صرف خدا کی پرستش کرو گے‘ شیطان کی پرستش نہیں کرو گے اور یہ ہے وہ عہد جسے یہ یومِ الست بھی کہتے ہیں۔ وہ عہد کیا جس کا کسی کو علم ہی نہ ہو کہ ہم سے لیا گیا ہے۔ عہد تو وہ ہوتا ہے جو کسی کے علم میں ہو‘ وہ رضامندی سے معاہدہ کرے‘ معاہدے کا اس کو معلوم ہو‘ پتہ ہو‘ وہ ساری عمر اُس کے سامنے ہو‘ اُس کے برخلاف کوئی چلے تو وہ کہہ سکتا ہے کہ یہ تم نے عہد کیا تھا‘ یہ تم نے معاہدہ کیا تھا۔ جس عہد کا پتہ ہی نہ ہو‘ کسی کو یاد ہی کچھ نہ ہو‘ اُس عہد کی پابندی کا تقاضا کیا ہے‘ اس کے توڑنے کی سزا کیا ہے‘ وہ تو کسی کو پتہ ہی نہیں۔ تو یہ یومِ الست معاہدہ تھا اور پھر وہ ہر انسان سے‘ ہر روح سے‘ کیا گیا تھا۔ روح ہر انسان میں ہوتی ہے۔ جب وہ دنیا میں آتا ہے‘ اس لیے ہر انسان سے گویا یہ ہر بنی آدم سے عہد لیا گیا۔ اب اسی سے آگے یہ بحث چلی۔

انسان کی فطرت اور ہدایتِ خداوندی

آپ کے ہاں ایک عام فقرہ ہے کہ اسلام دینِ فطرت ہے۔ بھئی! یہ فطرت کیا ہے‘ دینِ فطرت کیا ہے؟ فطرت کے متعلق تو کئی دفعہ بات آ چکی۔ دینِ فطرت کیا ہے؟ کہ جی! خدا کی ہستی کا اعتراف‘ ایمان کا اقرار‘ انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ تو بھئی! فطرت میں جو چیز ہوتی ہے اس کے خلاف تو کوئی کچھ کر نہیں سکتا۔ مثلاً اشیائے کائنات کی فطرت ہے۔ جو بھی اُس کی فطرت ہے وہ تو اس کے خلاف نہیں کر سکتا‘ اُس کو بھلا نہیں سکتا۔ اب اگر ہر انسان کے اندر یہ خدا کی فطرت موجود ہے تو پہلے تو یہ ہے کہ اتنے کروڑ انسانوں کو کیا کرو گے جو اس کا انکار کرتے ہیں‘ Atheists (دہریئے) بھی ہوتے ہیں‘ خدا کے رسول کا انکار کرتے ہیں۔ پھر ہر ایک انسان اور ہر مذہب اور فرقہ‘ ہر گروہ‘ اپنے اپنے تصور کا خدا رکھتا ہے۔ تو یہ اقرار کس قسم کا ہوا کہ ہر ایک نے اپنے ذہن کے مطابق‘ اپنے تصور کے مطابق‘ کچھ کہہ دیا کہ میں خدا کا اقرار کرتا ہوں۔ آپ نے دیکھا کہ ایک اینٹ غلط رکھی جائے تو ’تا ثریا می رود دیوار کج‘ اوپر جتنی دیوار اٹھتی ہے‘ ساری ٹیڑھی اٹھتی چلی جاتی ہے۔

یہ بات بڑی آسان سی تھی۔ حیرت ہوتی ہے مجھے ان مقام پہ جب میں آتا ہوں۔ عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ یہ جو عہد ہے اس

کے بعد الیٰ آتا ہے تو اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی کو حکم دینا' کسی کو تاکید کرنا''۔ اب یہ جو چیز ہو کہ بنی آدم کو یہ کہا گیا کہ خدا کی محکومیت اختیار کریں اور شیطان کی نہ کریں یعنی اپنے جذبات کو الٰہ نہ بنائیں یہ جو چیز تھی حضراتِ انبیائے کرامؑ کا سلسلہ رشد و ہدایت خدا کی طرف سے جو آتا تھا' وہ کہتا یہ تھا کہ ان اعبدوا اللہ یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ تمہاری طرف ہم نے یہ حکم بھیجا' ہر نبی کی وساطت سے یہ حکم بنی آدم کی طرف بھیجا جاتا رہا۔ اور وہ جو شروع میں قصہ ابلیس و آدم کا ہے وہ میں بتا چکا ہوں کہ وہ کیا چیز ہے۔ بہرحال آدم سے کہا کہ یَاْتِیَنَّکُمْ مِّنِّیْ ھُدًی فَمَنْ تَبِعَ ھُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ(2:38)۔ ہم بھیجیں گے تمہاری طرف اپنی راہنمائیاں رسولوں کی وساطت سے' وہ آ کے تمہیں بتائیں گے کہ خدا کی محکومیت اختیار کرنی ہے کسی اور کی نہیں۔

اصل بات تو یہ ہے کہ خدا تعالیٰ انسانوں کو اپنی طرف سے بھیجی گئی راہنمائی کا احساس دلاتا ہے

گویا خدا رسولوں کو یہ بات کہے گا اور وہ رسول یہ چیز آگے بنی آدم سے کہیں گے کہ یہ ہوا وہ عہد' جسے آپ کہتے ہیں کہ عہد لیا' خدا نے حکم دیا بنی آدم کو' انبیائے کرامؑ کی وساطت سے' وحی کے ذریعے سے' یہ کوئی یوم الست کا عہد نہیں ہے کہ جس کا کسی کو پتہ ہی نہیں کہ ہم سے کوئی عہد لیا گیا تھا' کسی کو یاد ہی نہیں' خیال تک بھی کسی کو نہیں۔ یہ یوم الست کی چیز بھی غلط ہے کہ ہر ایک کے اندر یہ احساس موجود ہے۔ تو یہ معاہدہ یا عہد لینے والی بات نہیں ہے۔

کہا یہی گیا ہے جو میں نے پہلے کہا تھا کہ اس میں دو شرطیں ہیں کہ خدا کا یہ پیغام انسانوں تک پہنچ چکا ہو اور ان انسانوں کی ذہنی سطح اتنی بلند ہو کہ وہ سمجھ جائیں کہ یہ کیا کہا جا رہا ہے' پھر وہ ماخوذ ہو سکتے ہیں۔ یہ وہ کہا ہے کہ ہم تم سے شروع سے کہتے چلے آ رہے ہیں' تمہاری طرف یہ راہنمائی بھیجتے چلے جا رہے ہیں' حکم دیتے چلے آ رہے ہیں کہ تم نے صرف خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔ اپنے جذبات کی محکومیت یا جو بڑے بڑے سرغنے جو قوتیں حاصل کر لیتے ہیں' ان کی محکومیت اختیار نہیں کرنا' یہ تمہارے سخت دشمن ہیں' یاد رکھو! تمہاری ذات کے چھپے ہوئے دشمن ہیں۔ اس لیے اَنِ اعْبُدُوْنِیْ (36:61) صرف میری محکومیت اختیار کرو اور یہی ہے وہ سیدھا راستہ جس پہ چلنے کی تم دعائیں مانگا کرتے ہو کہ اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ (1:5) بارالٰہا! زندگی کا وہ سیدھا اور ہموار راستہ ابھر اور نکھر کر ہمارے سامنے آ جائے۔

دنیا میں وہی نظام قائم رہ سکتا ہے جو پوری نوعِ انسانیت کے لیے منفعت بخش ہو

کہا ہے کہ یہ جو انسانوں کا خود اپنے ہی مفاد پرستیوں کے جذبات کے تابع چلنا ہے' جو بلند اقدارِ خداوندی ہیں ان کی اطاعت نہ کرنا ہے' اپنے اپنے جذبات کو خدا بنا لینا ہے' اس کے لیے کہا تھا کہ وَلَقَدْ اَضَلَّ مِنْکُمْ جِبِلًّا کَثِیْرًا (36:62) تمہارے مفاد

پرستانہ جذبات' اور سرکش سرغنے تمہاری بڑی بڑی جماعتوں کو غلط راستے پر ڈال دیں گے۔ یہاں تو اس بات میں بڑے بڑے گروہوں کو' بڑی بڑی جماعتوں کو' بڑی بڑی قوموں کو' گمراہ کر کے رکھ دیا ہے۔ خواہ وہ فرد ہو اپنے مفاد کے لیے اور خواہ وہ قوم ہو قومی مفاد کے لیے' دین تو ہے پوری نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے اسی لیے کہا وَ اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ (13:17) جو چیز پوری نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے ہو' اُسی کو بقا حاصل ہو سکتی ہے' وہی باقی رہ سکتی ہے اور دوسری چیزیں سب مٹ جائیں گی' ذاتی منفعت' گروہی منفعت' قومی منفعت' خاندانی قبائلی یہ کچھ باقی نہیں رہے گا جو مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ ہے' وہی رہے گا۔ یہ نظریہ' یہ عقیدہ' یہ مسلک' یہ عمل' یہ پروگرام ہے' جسے بقا حاصل ہے۔ کہا کہ بڑی بڑی قوموں کو' بڑے بڑے گروہوں کو اس ایک چیز نے تباہ کر دیا ہے' گمراہ کر کے رکھ دیا ہے کہ وہ اپنے ہی مفاد کے تابع چلنے لگے گئے۔ یہ جذباتی چیز تھی جسے کہا کہ اُس کے تابع چلے۔

عقلِ انسانی کو وحی کے تابع رکھنے کا دوسرا نام صراط مستقیم ہے

آگے ہے کہ اَفَلَمۡ تَکُوۡنُوۡا تَعۡقِلُوۡنَ (36:62) اس طرح تمہاری اکثریت صحیح راستے سے بہک جائے گی۔ ہم نے یہ سب کچھ واضح طور پر بتا دیا تھا لیکن تم نے ذرا عقل وفکر سے کام نہ لیا۔ غور فرمایئے! کہا جاتا ہے کہ عقل وفکر کو دین کے اندر دخل ہی نہیں ہے۔ جذبات کا مقابلہ یہاں قرآن نے عقل سے کیا ہے کہ یہاں تو یہ چیز ہے' انسان کی زندگی کا جسے صحیح صراطِ مستقیم کہتے ہیں' وہ یہ ہے کہ انسان کے جذبات اُس کی عقل کے تابع رہیں اور اُس کی عقل وحی خداوندی کے تابع ہو۔ یہ ہے دین' یہ ہے اسلام' یہ ہے ایمان' یہ ہے صحیح مسلک' یہ ہے صراطِ مستقیم۔ ہر ایک اپنے اپنے مقام پر ہے' جذبات قابلِ نفرت شے نہیں ہے' یہ ایسی شے نہیں ہے کہ جس کو فنا کر دینا چاہیے۔ جذبات عقل کے تابع ہوں' عقل ایسی چیز نہیں ہے کہ جس کے پیچھے لٹھ لے کر تم پھرتے رہو کہ اس سے کام لینا ہی حرام ہے۔ وہ اپنے مقام پہ ہے' جذبات عقل کے تابع اور عقل انسانی وحی خداوندی کی روشنی میں کام کرے گی' اُس کی حدود کے اندر رہتے ہوئے کام کرے گی' بس یہ ہے جو صحیح راستہ ہے جو قرآن نے بتایا ہے۔ اس کے خلاف جاؤ گے تو کہا کہ ہٰذِہٖ جَہَنَّمُ الَّتِیۡ کُنۡتُمۡ تُوۡعَدُوۡنَ (36:63) تو پھر یہ جہنم کی زندگی ہے جس سے تمہیں بار بار آگاہ کیا جاتا تھا۔

آج پورے کرہ ارض کا ہر فرد سکونِ قلب کی نعمت سے محروم ہے

وہاں کے جہنم کی زندگی پہ تو ہمارا ایمان ہے' وہ تو وہاں ہوگا۔ یہ آج کا جہنم تو ساری دنیا کو محیط ہے۔ ساری دنیا میں جو بڑی بڑی خوشحال قومیں ہیں' وہ بھی عذاب کے اندر مبتلا ہیں' کوئی ایک فرد بھی نہیں ہے جو سکون کی نیند سو سکے۔ جتنے اونچے چلے جایئے' اتنا ہی اضطراب بڑھتا چلا جائے گا۔ سربراہانِ مملکت کو دیکھیے تو معلوم نہیں کہ وہ رات کو سو بھی سکتے ہیں یا نہیں سو سکتے۔ آپ دیکھتے ہیں کس

طرح سے وہ بھیگی بلی کی طرح بھاگے بھاگے پھرتے ہیں۔ کس مصیبت کے اندر گرفتار ہیں؟ یہ لوگ کس جہنم کے اندر گرفتار ہیں؟ کہا ہے کہ اِصۡلَوۡهَا الۡيَوۡمَ بِمَا كُنۡتُمۡ تَكۡفُرُوۡنَ (36:64) اس میں داخل ہو جاؤ۔ یہی تمہاری زندگی ہوگی۔ پھر سن لو کہ یہ اس لیے ہے کہ تم نے صحیح روش پر چلنے سے انکار کیا تھا۔ اس طرح تم نے یہ جو بات اوپر کہی تھی' اُس سے انکار کیا' اپنی اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے چلے' آج اس جہنم کے اندر داخل ہو جاؤ۔ اب یہ جہنم ایسا نہیں ہے' دنیاوی عدالت کی طرح کہ وہاں جا کر جھوٹ بول دیا' جھوٹے گواہ لے آئے اور غلط شہادتیں پیش کر دیں' اپنے جرم سے انکار کر دیا تو اکثر و بیشتر چھوٹ ہی گئے۔ وہاں یہ نہیں ہے۔

جرم کا اقرار انسان کے جسم کا ایک ایک انگ خود کرے گا

وہاں کا انداز قرآن نے بتایا ہے اور بات یہاں بھی اس سے چلتی ہے کہ اَلۡيَوۡمَ نَخۡتِمُ عَلٰٓى اَفۡوَاهِهِمۡ وَتُكَلِّمُنَآ اَيۡدِيۡهِمۡ وَتَشۡهَدُ اَرۡجُلُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ (36:65) جو کچھ کسی نے کیا ہوگا' زبان سے اس کے اقرار کرانے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔ اگر وہ اس کا اقرار نہیں کرتا ہے تو اس کے ہاتھ' اس کے پاؤں' اس کی آنکھیں' سب اس کے خلاف شہادت ہونگے' وہ بولیں گے کہ ہم نے یہ کیا تھا۔ یہ ہاتھ اور پاؤں کی شہادت پر آپ غور کیجیے کہ یہ جو ہمارے ہاں کے اس دور میں بھی عدالتی عدل کے لیے بھی یہ جو تفتیش کا طریق ہے اُس میں یہ انگوٹھے کے نشان اور وہ جو پاؤں کے نشانات سے جو ہمارے ہاں کھوجی کسی مجرم کا پیچھا کرتے ہیں' اس حد تک تو یہاں بھی یہ صورت ہے۔ اگر مجرم کا نہ بھی معلوم ہو کہ کون ہے تو سب سے پہلے پولیس آ کر یہ کہتی ہے کہ وہ نشانات نہ مٹائیے' یہ Evidence (شہادت) ہوتی ہے۔ وہ دیکھتے ہیں کہ کسی جگہ کمرے کے اندر' کسی دیوار کے اوپر' اس کا ہاتھ لگ گیا ہے' وہ اس کو محفوظ کر لیتے ہیں۔ پاؤں کے نشانات شہروں کے اندر تو وہ باقی نہیں رہتے' گاؤں کے اندر تو تفتیش کا سب سے بڑا حربہ یہ پاؤں کے نشانات ہوتے ہیں۔ اور پھر یہ جو اُس نے کہا ہے کہ یہ ہاتھ گواہی دیں گے پاؤں گواہی دیں گے۔ اس پر آج دنیا انگشت بدنداں ہے۔

ارب ہا ارب انسانوں کے انگوٹھوں کے نشانات کی کیفیت ایک دوسرے سے مختلف ہے

دنیا کے یہ بڑے بڑے مفسر اس چیز کو دیکھ کر انگشت بدنداں ہیں' عزیزانِ من! کہ ازل کے دن سے لے کر جب سے انسانیت شروع ہوئی' انسان پیدا ہونا شروع ہوا' کروڑوں اربوں' لاتعداد' اس کا تو حساب ہی نہیں کہ کتنے انسان آئے اور چلے جا رہے ہیں' قیامت تک کتنے آئیں گے چلے جائیں گے اور یہ چیز ہے کہ کسی انسان کے انگوٹھے کی لکیریں کسی دوسرے انسان کے انگوٹھے کی لکیروں سے مل ہی نہیں سکتیں' یہ منفرد ہیں۔ سوچنے سے دماغ چکرا جاتا ہے' عزیزانِ من! یہ لکیریں کتنی ہیں' یہ میدان کتنا ہے جس کے

اندر اس قدر تغیر' اس قدر اختلاف' اس قدر انفرادیت ہے! یہ چند ہی تو لکیریں ہیں۔ ارب ہا ارب انسانوں کے انگوٹھے اس شہادت کی خاطر' اس خالقِ انسانیت نے یہ بنائے۔ انگوٹھے کی جو شہادت ہے' سب سے بڑی جو شہادت ہے' عدالت میں آج بھی یہ شہادت گنی جاتی ہے۔ اس کے اوپر ایکسپرٹ بٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ بتا دیتے ہیں کہ ہاں یہ مجرم کا انگوٹھا ہے یا یہ اس کا نہیں' کبھی ایک کی لکیریں دوسرے سے ملتی ہی نہیں ہیں۔ اندازہ لگائیے کسی بڑے سے بڑے آرٹسٹ سے کہیے' دو چار دس بیس بنانے کے بعد وہ عاجز آ جائے گا' کوئی نہ کوئی لکیر دوسری لکیر سے مل جائے گی۔ اتنا جو تنوع ہے' اتنا جو Change (تغیر) ہے' محدود انسانیت کا جو ذہن ہے' یہ اتنی لامحدود Change (تغیر) کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ کہیے کسی کو بنا کر' بتائے۔ پانچ دس انگوٹھے اس کی رو سے' جو ایک کی لکیریں دوسرے سے نہ ملیں۔ یہاں بھی تو اس کے معنی ہیں کہ تمہارے ہاتھ شہادت دیں گے' تمہارے پاؤں دیں گے' یہ شہادت ملے گی نہیں ایک دوسرے کے ساتھ' ایک کی شہادت دوسرے کی شہادت سے مل نہیں جائے گی' یہ شہادت ہوئی!

دنیا بھر کے طبقوں کی راہنمائی کے لیے خیر و شر کے مسئلے کا قرآنی حل

کہا ہے کہ **وَلَوْ نَشَآءُ لَطَمَسْنَا عَلٰٓى اَعْيُنِهِمْ فَاسْتَبَقُوا الصِّرَاطَ فَاَنّٰى يُبْصِرُوْنَ - وَلَوْ نَشَآءُ لَمَسَخْنٰهُمْ عَلٰى مَكَانَتِهِمْ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مُضِيًّا وَّلَا يَرْجِعُوْنَ (36:66.67)** اگر ہمارا قانون مشیت ایسا نہ ہوتا کہ انسان اپنی مرضی سے جس راستے پر چلنا چاہے اسے چلنے دیا جائے تو ہمارے لیے یہ کیا مشکل تھا کہ ہم ان مخالفینِ نظام حق و صداقت کی بینائی سلب کر لیتے اور یہ راستے کی تلاش میں اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے لیکن انہیں کچھ دکھائی نہ دیتا۔ یا ہم ان کی تمام قوتوں کے علی الرغم' انہیں اس قدر کمزور اور ناتوان کر دیتے کہ یہ نہ آگے بڑھ سکتے' نہ پیچھے لوٹ سکتے۔ اس طرح ہم ان کی مخالفت کو روک سکتے تھے لیکن ہم ایسا نہیں کرنا چاہتے۔

عزیزانِ من! یہ اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ خدا قادرِ مطلق ہے' وہ اتنے اتنے بڑے بڑے جو ظالم ہیں' مجرم ہیں' یہ فوراً ان کو روک کیوں نہیں دیتا' جس ظالم کا مظلوم پہ ہاتھ اٹھتا ہے خدا اس ہاتھ کو پتھر کیوں نہیں بنا دیتا۔ یہ ایک فلسفے کا پرانا ذہنِ انسانی کا مسئلہ ہی نہیں ہے۔ اس کو تو چیستاں' معمہ کہتے ہیں' یہ چلا آ رہا ہے کہ اگر دنیا میں Evil (شر) جرم برائیاں خدا کی مرضی کے علم الرغم ہیں اور وہ نہیں چاہتا کہ یہاں رہیں تو پھر خدا قادرِ مطلق نہیں ہے اور اگر اس کی مرضی سے ہیں تو پھر وہ خیرِ مطلق نہیں ہے۔ یہ منطقیں ہیں' الجھاؤ ہے' الفاظ ہی تو ہیں۔ یہ اُس قادرِ مطلق نے ہی تو کہا ہے کہ ہم نے انسان کو اتنا اختیار دے رکھا ہے کہ وہ یہ کچھ کرے اور ہم دخل نہیں دیتے۔ اتنی سی چیز ہے' قرآن نے آ کر اس مسئلے کو' آپ احباب کو تو ان کا علم نہیں ہے' مجھ سے پوچھیے کہ جس کی عمران کی

تاریخ کے اندر گزری ہے' حل کر کے رکھ دیا۔ یہ اسلام ہی کا مسئلہ نہیں ہے' یہ جو تقدیر کا کہہ رہے ہیں' یہ یونان کے حکما کے زمانے سے چلا ہوا ہے۔ لائبریریوں کے بڑے بڑے ہال بھر جائیں کہ جتنا کچھ اس مسئلے کے اوپر لکھا گیا ہے کہ خیرِ مطلق ہے یا قادرِ مطلق ہے اور وہ دونوں حل نہیں ہوتے ہیں' ڈور کو سلجھا رہے ہیں اور سرا ملتا نہیں'۔ اور سرا تو قرآن نے آ کر دیدیا کہ ہم نے اپنے اختیارِ کلی کے تابع انسان کو ایک حد تک صاحبِ اختیار و ارادہ بنا دیا اور اُس میں ہم دخل نہیں دیتے۔ یہی انسانیت کا شرف ہے۔ مسئلہ حل ہو گیا۔ اگلی بات یہ ہوئی کہ ہم نے اس کو بتا دیا کہ شر کیا ہے اور خیر کیا ہے اور پھر اس کو چھوڑ دیا وَهَدَيْنٰهُ النَّجْدَيْنِ (90:10) چوراہے پہ چھوڑ دیا' دونوں راستے نمایاں طور پہ اس کے سامنے کر دیئے اور اس کو کہہ دیا کہ جونسا راستہ جی چاہے اختیار کر لو۔ کس آسانی سے مسئلہ حل ہو گیا۔ قرآن نے تو کیا تھا لیکن چار ہی دن کے بعد آپ پھر الجھ گئے۔ آپ کے ہاں بھی تو جیسا میں نے کہا ہے تقدیر کا مسئلہ آپ کا جزوِ ایمان بنا ہوا ہے اور پھر یہی چیز ہے۔ پھر یہاں آ کر ان کو مصیبت پڑی ہوئی ہے کہ پہلے سے اگر خدا نے لکھ دیا ہے کہ یہ جہنمی ہے' تو یہ لاکھ کوشش کرے یہ بچ ہی نہیں سکتا کیونکہ اس کے متعلق تو خدا نے فیصلہ کر دیا کہ جہنمی ہے اور جس کے متعلق اُس نے فیصلہ کر دیا کہ یہ جنت میں جائے گا تو وہ یہاں جو جی میں آئے کرتا پھرے' وہ جنت میں جائے گا۔

''خدا کے متعلق یہ تصور کہ وہ خود ہی گمراہ کرتا ہے اور خود ہی اسے جہنم میں پہنچا دیتا ہے'' کی قرآن سے وضاحت

عزیزانِ من! آپ کے ہاں کے یہ مسائل ہیں کہ وہی ہدایت دیتا ہے' وہی گمراہ کرتا ہے' اور وہی جہنم میں بھیج دیتا ہے یعنی پہلے گمراہ کرتا ہے پھر جہنم میں بھیج دیتا ہے۔ یہ جو آپ کے ہاں عدالت کا یا نظم و نسق کا یا جرائم کا باطل نظام ہے' اُس میں تو یہ ہوتا ہے کہ پولیس والے پہلے چرس کی یا افیون کی پڑیا اندر پھینک دیتے تھے' پھر گرفتار کر کے جیل میں بھیج دیتے تھے۔ تو کچھ ایسا ہی ہوا کہ پہلے اُس نے یہ کر دیا اور پھر اس کو پکڑ لیا۔ اتنی سی بات ہے۔ آپ دیکھتے ہیں' عزیزانِ من! کہ قرآن کس قدر چند ایک اشاروں میں' چند ایک الفاظ میں' دنیا کے اتنے اتنے اہم مسائل حل کرتا ہے جن میں صدیوں سے عقلِ انسانی الجھی ہوئی چلی آ رہی ہے۔ وہ تو انہیں یوں حل کر کے رکھ دیتا ہے۔

کہا یہ ہے کہ اگر ہم چاہتے' اگر ہماری مشیت ایسی ہوتی' جیسا تم کہتے ہو' تو ٹھیک ہے ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ ہم ان کی بینائی سلب کر لیتے' یہ اندھے ہو جاتے' راستہ ہی ان کو دکھائی نہ دیتا۔ ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں تھا کہ یہ اتنی قوت رکھتے ہیں' اس کے بعد ان کی قوت سلب کر لی جاتی اور یہ کچھ کر ہی نہ سکتے۔ ہمارے لیے کچھ مشکل ہی نہیں تھا' ہم قادرِ مطلق ایسے ہیں لیکن ہماری مشیت کا یہ تقاضا نہیں تھا۔ ہم نے قوانین دیئے اور ان قوانین کے تابع افراد کی بھی یہ کیفیت ہے' اقوام کی بھی یہ کیفیت ہے۔ اقوام کے فلسفے میں بھی یہ ہے' قومیں آتی ہیں' پہلے ان کا بچپن کا زمانہ ہوتا ہے' تیاریوں کا زمانہ ہوتا ہے' آہستہ آہستہ اپنے آپ کو

Develop کرتی ہے' پھران کا شباب کا زمانہ آتا ہے' جوانی کا زمانہ آتا ہے' اُس شباب کے زمانے کے بعد پھر آہستہ آہستہ انحطاط کا زمانہ آتا ہے۔ اُس نے کہا ہے کہ یہی چیز ایک فرد کے ساتھ بھی تم دیکھو' ایسی ہی ہوتی ہے۔ بچپن آتا ہے' بھرپور جوانی آتی ہے' پھر طبعی طور پر بڑھاپا آتا ہے۔ یہ سارا کچھ قوانین کے تابع ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ ہم اس بچپن کے بعد از خود ہی کسی کو ایسے جوان کر دیں' پھر خود ہی اس کو ایسا اوندھا کر دیں' بڑھاپا آجائے' قویٰ کمزور ہو جائیں' اضمحلال پیدا ہو جائے۔ ایک قانون ہے اس کے تابع یہ کچھ ہوتا ہے۔

انسانی جسم تو عمر کے ساتھ ساتھ کمزور ہو ہی جاتا ہے لیکن اس چیز کا اثر اس کی خودی یا انسانیت پر نہیں پڑتا

کہا ہے کہ وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ (36:68)۔ یہ بات ایسی ہے جو عقل وفکر سے سمجھنے کی ہے کہ جو شخص بھی عمر رسیدہ ہو جاتا ہے' بڑھاپا آتا ہے' اس پہ اضمحلال آجاتا ہے' اس کے قویٰ میں کمزوری آجاتی ہے' وہ مضمحل ہو جاتے ہیں جسے اوندھا ہونا کہتے ہیں' وہ چیز پیدا ہو جاتی ہے لیکن قرآن کا اعجاز ہے' یہ جو کہا ہے کہ یہ اضمحلال' یہ کمزوری' یہ اوندھا ہو جانا' یہ پیدا ہو جاتا ہے اس کے اندر۔ فِي الْخَلْقِ کہا ہے۔ اس کی طبعی زندگی میں یہ بات ہوتی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس کی جو انسانیت ہے' اس پہ بھی یہی کیفیت ہو جاتی ہے۔ کیا بات ہے صاحب! ایک لفظ سے جو کہہ گیا ہے کہ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ (36:68) یہ جو اس کی Physical Form ہے' اس کی جو طبعی کیفیت ہے' یہ اس پہ آتا ہے کہ بچپن ہے' پھر جوانی ہے' پھر بڑھاپا ہے' اس عمر کو تو دوسری جگہ قرآنِ کریم نے ارذل العمر (16:70) بھی کہا ہے کہ عمر کا وہ حصہ جس میں وہ بہت کمزور ہو جاتا ہے اور اس میں ایک چیز بتائی ہے' جس کا Memory (حافظے) سے تعلق ہے۔ کہا ہے کہ وَ اللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمْ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْ لَا يَعْلَمَ بَعْدَ عِلْمٍ شَيْـًٔا (16:70) بڑھاپے میں جا کر قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں تو حافظے پر بھی اثر پڑ جاتا ہے کہ جو چیزیں پہلے یاد ہوتی ہیں' علم میں ہوتی ہیں' بڑھاپے میں حافظہ کمزور ہو جاتا ہے تو انسان کو وہ بھی بھول جاتی ہیں۔ اور یہیں سے اگرچہ متعدد بار یہ بات آچکی کہ قرآنِ کریم نے یہ کہیں جوانوں کو نہیں کہا کہ تم ماں باپ کے فیصلوں کی اطاعت کرو' وہ تو ارذل العمر کے اندر ان کو پہنچا رہا ہے' بڑھاپے میں وہ تو انہیں کہہ رہا ہے کہ جو کچھ انہیں پہلے یاد ہوتا ہے' وہ بھی بھول جاتے ہیں۔ تو جن کی کیفیت یہ ہو' کہ جو ابھی ابھرنے والے ہیں' جن کی صلاحیتیں برومند ہو رہی ہیں' جن کا زمانہ پہلے سے بہت آگے بڑھ گیا ہوا ہے' ان سے یہ کہنا کہ ان لوگوں کی اطاعت فرض ہے جن کے متعلق خدا خود کہتا ہے کہ وہ جو کچھ پہلے یاد ہوتا ہے' وہ بھی بھول جاتے ہیں۔ صحیح نہیں ہے۔

بڑھاپے میں ماں باپ سے حسن وسلوک سے پیش آنے کی ہدایت

اسی لیے اُس نے ماں باپ کے متعلق یہ کہا ہے کہ ان کے ساتھ حسنِ سلوک کرو' نرمی سے پیش آؤ' وہ اس کے مستحق ہیں۔

تمہارے بچپن میں انہوں نے تمہاری وہ حالت جو بچپن کی تھی کہ نہ عقل تھی' نہ فکر تھی' نہ کسی چیز کے کرنے کی تمہیں ہمت تھی' نہ طاقت تھی' اُس حالت میں اُنہوں نے کس طرح تمہیں پالا پوسا۔ اگر وہ پلٹ کر اس حالت میں پہنچ گئے ہیں' کمزوری آ گئی ہے' وہ کمانے کے قابل نہیں رہے ہیں' حافظہ بھی قائم نہیں رہا' ان کی جو تخلیقی کیفیت ہے' ان کی جو طبعی زندگی ہے' اس میں کمزوری آ گئی ہے تو اس سے زچ نہ پڑو۔ اگر زچ پڑ جاتے وہ تمہارے بچپن کے زمانے میں' سوچو تو سہی' دن رات میں چوبیس گھنٹے' ایک بچہ سردی کے زمانے میں بھی کتنی مرتبہ پیشاب کر کے بستر کو گیلا کرتا ہے' ماں کبھی اس کو چانٹا نہیں مارتی' خود گیلے بستر کی طرف ہو جاتی ہے' اس کو خشک بستر کے اوپر لٹاتی ہے۔ کیا انداز ہے قرآن کے بات سمجھانے کا! اُس نے کہا کہ جس نے اس طرح سے تمہاری پرورش کی' اب اگر ان کے قویٰ میں کمزوری آ گئی ہے' اس کی کیفیت یہ ہے کہ دوسری دفعہ اُس نے بات کہی تو تم نے کہا ''ابا جی! کی تسی ہر ویلھے اس طراں نال ٹاں ٹاں لا رکھدے ہیگے او''[1]۔ کہا کہ اگر یہ اُس وقت وہ کرتے تو کیا تم زندہ بھی رہ سکتے تھے؟ اُنہوں نے اتنی بردباری اور برداشت اور تحمل اور استقلال سے کام لیا جب جا کر تمہاری پرورش ہوئی ہے۔ اب اگر یہ طبعی طور پر' اس کیفیت میں پہنچ چکے ہیں' جس میں کہ ایک بچہ ہوتا ہے' تو کیا یہ تقاضا نہیں ہے کہ تم ان کا خیال رکھو۔ اور کچھ نہیں ہے جو عام طور پہ ہمارے ہاں احسان کے معنی لیے جاتے ہیں' کہا ہے کہ **وَ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا (2:83)** کیا اس احسان کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ ان کے ساتھ وہی حسنِ سلوک تم کرو۔ یہاں حسن سلوک کہا ہے' اطاعت نہیں ہے۔ اطاعت تو صرف احکامِ خداوندی کی ہے۔ جو فیصلے ہیں' وہ جن کے قویٰ مضبوط ہوتے ہیں' وہ فیصلے حالات کا جائزہ لے کر کرتے ہیں' تعلیم میں' ماحول میں آنے والی نسل ہم سے' پرانے لوگوں سے' یقیناً آگے ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ تین تین سال کے بچے جو ٹی وی دیکھتے ہیں انہیں اتنی معلومات ہوتی ہے جو ہمیں اس وقت تک نہیں ہوتیں۔ زمانہ تو اتنی تیزی سے آگے جا رہا ہے' اس طرح سے آگے جانے والوں کے متعلق کہ تم سے پچاس سال پیچھے کے زمانے کے جو لوگ ہیں' ان کے فیصلوں کی اطاعت کرو' اگر آنے والی نسلیں جانے والی نسلوں کی اطاعت کریں تو غار میں جو لوگ رہتے ہیں تو ہم وہاں کے وہاں ہوتے' ایک قدم آگے نہ بڑھ سکتے۔ قرآن نے **ارذل العمر (16:70)** کہا ہے **نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ (36:68)** کہا ہے۔ **اَفَلَا يَعْقِلُوْنَ (36:68)** کہا ہے۔ اس کے لیے خاص طور پہ کسی نبی بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی جو تمہیں آ کر وحی کے ذریعے بتاتا کہ دیکھیے کس طرح سے بڑھاپا آ گیا' وہ تو تمہارے سامنے ہے' عقل و فکر سے یہ چیز سمجھ سکتے ہو۔ لیکن اتنی بات جو کی' وہ وحی نے آ کر کہی کہ اس عمر کے اندر تم ان سے زچ نہ پڑ جایا کرو' یہ اس عمر سے گزر کر اس عمر کے درجے میں آ پہنچے ہیں' جہاں ان کے قویٰ کمزور ہو چکے ہیں۔ اسی طرح سے کہا کہ قوموں کی بھی یہ حالت ہے کہ اس طرح سے قوموں میں انحطاط آتا ہے۔ لیکن اگر قومیں غیر متزلزل اقدارِ خداوندی کے تابع چلتی

---

[1] ابا جان! یہ کیا آپ ہر وقت اس طرح ٹیں ٹیں لگا رکھتے ہیں۔

ہیں' تو پھر ان کے اندر یہ تبدیلی پیدا نہیں ہوتی کیونکہ یہ تبدیلی فِی الۡخَلۡقِ (36:68) پیدا ہوتی ہے' طبعی زندگی کے اندر پیدا ہوتی ہے۔ یہاں بھی جو فرد کے متعلق بھی کہا ہے کہ وہ نُنَكِّسۡهُ فِی الۡخَلۡقِ (36:68) کہا ہے۔ اس کی طبعی زندگی کے اندر یہ چیز واقع ہوتی ہے کہ کمزوری آتی ہے' اضمحلال ہوتا ہے۔ اقدار کی پابندی سے جو اس نے اپنے اندر جوہر پیدا کیے ہوئے ہیں' وہ خودی کا جوہر جو اس کے اندر مستحکم ہو گیا ہوا ہے' اس پہ کوئی اثر نہیں پڑتا۔ خودی کے مستحکم ہونے کے متعلق میں نے کہا تھا کہ تصوف تو ہمیشہ مثالوں سے سمجھایا جاتا تھا' بڑی اچھی مثال دیتے تھے کہ دیکھو بیٹا! دودھ میں پانی ڈالیے تو وہ دودھ اور پانی ایک ہو جاتے ہیں' دودھ کے اندر مکھن بھی ہوتا ہے' اگر اس طرح سے وہ رہے تو وہ پانی کا پانی ہوتا ہے' اس دودھ کو دہی بنا کر بلو لیجیے' جب وہی اس کی دوہنیت اس کے اندر جو مکھن ہوتا ہے' وہ سخت ہو جاتا ہے تو پھر سارا دن پانی کے مٹکے میں ڈالے رکھیے' اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔

قرآن حکیم کے حقائق کو واضح کرنے کے لیے تشبیہات و استعارات کی اہمیت

یہ بڑی اچھی مثالیں ہوتی تھیں۔ انسان کی خودی جب پختہ ہو جاتی ہے تو پھر حوادثِ دنیا اس کے اوپر اثر نہیں کر سکتے۔ یہ نُنَكِّسۡهُ فِی الۡخَلۡقِ (36:68) ہے۔ انسان کی ذات' انسان کی خودی' اس کا نفس' اس کا جوہرِ انسانیت' اس کا جو شرفِ انسانیت ہے' وہ بڑھاپے میں کم نہیں ہو جاتا' وہ تو اور پختہ تر ہو جاتا ہے' کیوں کہ اس نے اب جلدی سے اگلی منزل میں پہنچنا ہے۔ جوان کے لیے تو ابھی عام طور پہ وقت ہے کہ اگر کبھی خودی کمزور ہے تو اس کو اور زیادہ مستحکم کر لے اور وہ تو چلنے والا ہے' وہاں تو خودی بڑی مستحکم ہوتی ہے۔ یہ نظر آ گیا کہ طبعی جسم اگر کمزور ہوتا ہے' خودی مستحکم ہوتی ہے کہ طبعی جسم کی کمزوری سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اگلا قدم یہ ہے کہ طبعی قوانین کے تابع' جب یہ جو جسم ہے' یہ Disintegrate ہو جاتا ہے' جسے کہتے ہیں موت آ جاتی ہے' تو پھر موت سے بھی خودی کا کچھ نہیں بگڑتا' وہ مکھن بن چکی ہوئی ہوتی ہے' دودھ کے اندر رہنے والی دوہنیت نہیں ہوتی۔ کہا ہے کہ اَفَلَا یَعۡقِلُوۡنَ (36:68) کیا بات کہہ دی ہے اَفَلَا یَعۡقِلُوۡنَ نے! کہا کہ ہم یہ چیزیں مثالوں سے سمجھا رہے ہیں' تو اس سے کہیں یہ نہ سمجھ لینا کہ ہم یہ شاعری کر رہے ہیں۔ شاعری جذبات کے اظہار کا نام ہوتا ہے اور عام طور پہ تشبیہات اور استعارات کے ذریعے بیان ہوتی ہے۔ اور قرآن میں تو بے شمار باتیں اتنے اتنے بڑے جو حقائق ہیں' ان کو بیان کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہوتا ہے کہ ان کو مثالوں میں' تشبیہوں میں' استعاروں میں' بیان کیا جائے۔ جو Abstract Truths ہیں' محسوس نہیں ہوتے' ان کو مثالوں کے ذریعے بیان کرنا ہوتا ہے۔ تو کہا کہ یہ نہ کہیں سمجھ لینا کہ ہم شاعری کر رہے ہیں۔

قرآنِ حکیم کے نزدیک شاعری کی بنیاد صرف جذبات پر ہوتی ہے' حقائق پر نہیں ہوتی

کہا ہے کہ **وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ** (36:69) ہم نے اس رسول کو شاعری نہیں سکھلائی' یہ تو انقلاب برپا کرنے کے لیے آیا ہے اور ایک انقلابی کے لیے شاعری اس کے شایانِ شان نہیں ہوا کرتی۔ شاعری کے متعلق سورۃ الشعراء 26 ویں سورۃ میں جو ہم آئے تھے تو میں نے کئی درسوں میں وہ بات بیان کی تھی۔ اب میں پھر اس پہ چلا جاؤں گا تو موضوع سے دور نکل جاؤں گا۔ شاعری کے یہ معنی نہیں کہ اگر ایک حقیقت کو آپ منظوم طریقے سے' نظم میں' بیت ٹھیک ہو' اس کا وزن ٹھیک ہو' نظم کے ذریعے ادا کر دیں تو قرآن کی رو سے وہ جو چیز ہے وہ ناجائز ہو جائے گی اور اسی کو اگر نثر میں بیان کر دیں تو وہ جائز ہو جائے گی۔ شاعری کے معنی کوئی اسلوبِ اظہار نہیں ہے' بات کہنے کا طریقہ نہیں ہے۔ یہ جو شاعری ہے یا جو شعریت ہے' یہ ایک ذہنیت کا نام ہے۔ قرآن نے وہاں بتایا ہے کہ شعریت یا شاعری کی ذہنیت یہ ہے کہ وہ حقائق سے بات نہیں کرتی' لطائف سے بات کرتی ہے' وہ جذبات سے بات کرتی ہے' دلائل سے بات نہیں کرتی۔ شاعر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ **فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ** (26:225) عجیب چیز ہے یہ ہ ی م [1]۔ **الھیام** سخت ترین پیاس ہے۔ **عرب الایھم** اس اونٹ کو کہتے تھے جس کو جھوٹی پیاس ستا رہی ہو۔ جھوٹی پیاس ہے۔ سچ مچ کی پیاس میں تو پانی مل جائے تو اس سے تو تسکین ہو جاتی ہے۔ جھوٹی پیاس والے کی کبھی تسکین ہی نہیں ہوتی۔ یہاں **فی کل واد** کہا ہے۔ شاعر کی یہ کیفیت ہے کہ وہ جھوٹی پیاس والے اونٹ کی طرح' ہر وادی میں' ہر صحرا میں' ہر دشت میں' ہر نخلستان میں' ہر کوہسار میں' جدھر منہ اٹھائے چل نکلتا ہے اور پیاس بجھتی نہیں ہے کیوں کہ وہ جھوٹی ہوتی ہے۔ سب جھوٹ ہوتا ہے جو شاعر کہتا ہے۔ یہ جو فراق کے نالے لکھتا ہے' رونے روتا ہے' وہ بھی جھوٹ ہوتا ہے اور جو وصال کی لذتیں بیان کرتا ہے' وہ بھی جھوٹ ہوتا ہے۔ نہ اس کا کوئی رفیق ہوتا ہے' نہ اس کا کوئی محبوب ہوتا ہے' نہ محبوب کی گلیاں ہوتی ہیں' نہ رسوائیاں ہوتی ہیں' نہ عزتیں ہوتی ہیں' کچھ نہیں' سب خیالات کی دنیا ہوتی ہے۔ اور ساری عمر خواہ وصال کی غزلیں کہتا چلا جائے' عمر کے آخری حصے تک اونٹ کی طرح جھوٹی پیاس اس کو ستا رہی ہے' اس کی پیاس بجھتی ہی نہیں ہے۔ کیا کبھی کسی شاعر کو آپ نے یہ کہتے ہوئے سنا کہ نہیں بھئی! اب میں فراق کی بات نہیں کہوں گا کیوں کہ فراق کی منزل ختم ہو گئی' اب وصال کی منزل میرا مرحلہ آ گیا ہے' اب میری پیاس بجھ گئی ہے؟ یہ بجھتی ہی نہیں ہے۔ قرآن نے ایک مثال سے' میں کہتا ہوں' ایسا شاعر کو' شاعری سے مارا ہے کہ شاعر کی کیفیت کیا ہوتی ہے؟ یہ کہ **فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ** (26:225) ہے' جھوٹی پیاس والے اونٹ کی طرح' ہر وادی میں لگا پھرتا ہے اور پیاس ہے کہ بجھتی نہیں ہے۔

---

[1] یھیمون کا مادہ ھ ی م ہے۔

کہا یہ ہے کہ ایک وہ ہے جس نے انسانوں کی دنیا میں عالمگیر انقلاب برپا کرنا ہے' کیا اس کی یہ کیفیت ہوگی؟ وہ تو اپنے سامنے ایک مستقل نصب العین رکھے گا' اس کی نگاہ اس کی طرف اٹھے گی اور اس نصب العین تک پہنچنے کے لیے وہ مختلف طریقے اختیار کرے گا۔ یہ جذباتی چیز نہیں ہے' یہ زندگی کا عملی پروگرام ہے۔ دلائل و براہین سے اس کی صداقت کو' اس کی اہمیت کو' واضح کرے گا' عملی اقدام سے بتائے گا کہ میرا ہر قدم اس منزل کی طرف اٹھ رہا ہے وہ اِنَّا اِلَیۡہِ رٰجِعُوۡنَ (2:156) کہے گا' کہ جو ہمارا مقصود و منتہا ہے ہم ہر حال میں اسی کی طرف رجوع کریں' ہمارا ہر قدم اسی کی طرف اٹھے گا۔ اس کے برعکس شاعر تو فِیۡ کُلِّ وَادٍ یَّہِیۡمُوۡنَ میں ہوتا ہے اور مختلف وادیوں اور بیابانوں میں مارا مارا پھرتا ہے اس کی پیاس کہیں بجھتی ہی نہیں ہے۔ ساری عمر جذبات کا پرستار ہے اور جذبات بھی جھوٹے اور بناوٹی۔

عربوں کے ہاں شاعری کی اہمیت اور اس کا مقام

بات یہ ہے کہ اس میں اسلوبِ بیان کا تعلق نہیں ہے کہ نظم میں ایک حقیقت بیان کر دی جائے تو وہ ناجائز ہو جائے گی اور وہی چیز نثر میں بیان کر دی جائے تو جائز ہے۔ بات جو کہی جائے گی' اسے دیکھنا ہوگا کہ کیا کہا جا رہا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ ہم یہ مثالیں دے کر بات سمجھا دیتے ہیں تاکہ تمہارا ذہن ادھر جائے گا۔ اور عربوں کے ہاں تو پوچھو ہی نہیں کہ شاعری کو مقام کیا تھا۔ وہ تو شاعروں کی پرستش کرتے تھے' شعرا کے متعلق ان کا ایمان تھا کہ ان پہ وحی آتی ہے۔ اس لیے کہا ہے کہ اس کو شاعری نہ سمجھ لینا حالانکہ قرآن کا وہاں کے تمام شعرا کو اتنا بڑا چیلنج تھا کہ لاؤ اس کی مثل' دس آیتیں بنا کے لاؤ لیکن اس کے باوجود کہا ہے کہ یہ شاعری نہیں ہے' یہ حقائق بیان ہو رہے ہیں اور یہ انقلاب آفریں پیغام اور تعلیم ہے' یہ ایک عملی پروگرام ہے' منزلِ مقصود تک پہنچنے کا جو متعین طور پہ اس رسول کے سامنے ہے' شاعر یہ کچھ نہیں کر سکتا۔

انقلابی شخصیت تو ہمیشہ اپنے سامنے ایک عظیم پروگرام لیے ہوتی ہے

قرآنِ کریم کے وَمَا یَنۡۢبَغِیۡ لَہٗ (36:69) نے بات بڑی واضح کر دی کہ ایک انقلابی کے شایانِ شان ہی نہیں ہوتا کہ وہ اس طرح سے جھوٹی پیاس والے اونٹ کی طرح مارا مارا پھرتا رہے۔ اس کا تو ہر قدم اپنی منزل کی طرف اٹھتا ہے اور حقیقتاً اٹھتا ہے' وہ تصوراتی دنیا میں نہیں ہوتا' محض تخیل کے زور پر نہیں ہوتا کہ اب ہم نے محمل کو جا لیا اور ہم نے لیلیٰ کو پکڑ لیا' یہ سارا اس کے اپنے ذہن کے ہی اندر ہوتا ہے' وہ تو اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا سب کچھ کر رہا ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ اِنۡ ہُوَ اِلَّا ذِکۡرٌ وَّقُرۡاٰنٌ مُّبِیۡنٌ (36:69) یہ تو ایک کھلا ہوا واضح انقلابی پروگرام کا منشور ہے' اعلامیہ ہے' Proclamation ہے۔ قرآن کے معنی ہی

Proclamation کے ہیں۔ کسی مملکت کا پہلا اعلان جو ساری دنیا کے لیے ہوتا ہے یہ وہ ہے اور مبین ہے' نہایت واضح ہے' اس میں ابہام نہیں' اس میں کسی قسم کا التباس نہیں ہے' واضح ہے اور ہر وقت یہ سامنے رکھنے کی چیز ہے۔ یہ ایک متعین ضابطۂ حیات' ایک آئین' ایک منشور' ایک اعلامیہ' ایک Proclamation (اعلامیہ) ہے' مبین واضح ہر وقت نگاہوں کے سامنے رکھنے والا ہے اس کو شاعری سے کیا تعلق! وہاں شاعری میں تو نہ کوئی چیز متعین ہوتی ہے' نہ کوئی نصب العین ہوتا ہے' نہ وہی نصب العین ہر ایک کی آنکھوں کے سامنے ہوتا ہے' اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ یہ کاہے کے لیے ہے؟

جو کوئی بھی زندگی کے حقائق سے آگہی حاصل کرنا چاہے سورۃ یٰسٓ اس کے لیے اپنے اندر حیاتِ نو کا پیغام لیے ہوئے ہے

اب آ گیا وہ ٹکڑا جس سے میں نے سورۃ یٰسٓ کی ابتدا کی تھی۔ کہا ہے کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) یہ ہے وہ چیز اور اس پہ تو کئی درس گزر چکے ہیں تا کہ ان لوگوں کو جن میں ہنوز زندہ رہنے کی کوئی رمق باقی ہے اور انہیں زندہ رہنے کی تمنا ہے' تو انہیں زندگی کے خطرناک مقامات سے آگاہ کردے کہ وہ اس طرف نہ جائیں۔ من کان حیًا' عزیزانِ من! قرآن زندہ انسانوں کے لیے ہے' مُردوں کی بستی کے اندر جا کر وعظ کہنے کے لیے نہیں ہے۔ کیوں کہ گزشتہ دو تین چار درسوں میں یہ چیز آ چکی ہے اس لیے آج اس کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نے وہ پروگرام دیا تھا کہ جب رسول آتا ہے تو مخرج الحیَّ مَن المیّتِ (6:96)' یہ مُردوں کی بستی ہوتی ہے۔ اس کا پہلا کام یہ ہے کہ ان مُردوں کی بستی میں سے ان لوگوں کو الگ کردے جن میں زندگی کے آثار پائے جاتے ہیں اور انہیں زندہ رہنے کی آرزو ہے۔ کہا ہے کہ پہلے ان میں سے ان لوگوں کو الگ کرو۔ اور پھر قرآن کی شمع ان لوگوں کے ہاتھ میں دو۔ وہ ان لوگوں کے ہاتھ میں قرآن نہیں دیتا جو بے کار ہیں۔ مردہ روشنی کو کیا کرے گا۔ کہا ہے کہ پہلے انہیں زندہ کرو جن میں زندگی کے آثار موجود ہیں۔ یہاں یہ طبعی طور پہ مُردہ اور زندہ نہیں ہیں' جنہیں یوں Dead کہتے ہیں' جسے ہم مرگیا کہتے ہیں۔ یہ روز ہمارے ہاں میتیں ہوتی ہیں' موت ہوتی ہے اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ پہلے وہ اس قسم کی لاشیں ہوتی ہیں پھر وہ لاشوں کے سرہانے کھڑا ہو کر قم باذن اللہ کہتا ہے کہ اٹھ! اللہ کے حکم سے' پھر وہ زندہ ہو جاتا ہے۔ یہاں مُردہ وہ ہیں جن میں زندگی کی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔

اقبالؒ کے الفاظ میں ''تصوف سرزمینِ اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے''

اب پھر ہمارے ہاں کے حضرت صاحب ہیں۔ کیا کیا باتیں بتاؤں کہ انہوں نے کہا: قم باذن اللہ' تو وہ مُردہ اٹھا ہی نہیں تو مرید

نے پیر کی طرف دیکھا' کہنے لگے قم اور وہ اٹھ کر کھڑے ہوگئے اور کہا کہ ہمارے حکم سے اٹھے ہیں جناب! یہ شاعری ہوتی ہے' یہ سارا تصوف شاعری ہے۔ شاعر [1] نے کہا ہوا ہے کہ ''تصوف برائے شعر گفتن خوب است''۔ یہاں قرآن نے کہا ہے کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) تا کہ تُو اس کے ذریعے اس قوم کو جس میں زندگی کی حرارت باقی ہو اور وہ زندہ رہنا چاہے' غلط روش کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کردے۔ اس طرح جو زندہ انسان ہیں وہ اس سے آگہی حاصل کریں گے۔ عزیزانِ من! یہ بڑی مشکل منزل ہے۔ دیکھنے کی چیز یہی ہے کہ کیا ہمارا شمار زندہ انسانوں میں ہوتا ہے؟ اگر ہے تو پھر ان کو قرآن کچھ فائدہ دے گا۔ اسی لیے علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے سید سلیمان ندوی مرحوم (1884-1953ء) کے نام اپنے گرامی نامہ مورخہ 13 نومبر 1917ء میں دو ٹوک الفاظ میں تحریر فرمایا کہ ''اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے'' [2]۔

مرنے والے کی قبر پر قرآن پڑھنے کا نتیجہ

عزیزانِ من! کروڑ در کروڑ ہر روز یہ قرآن پڑھا جاتا ہے' ساری دنیا کے اندر پڑھا جاتا ہے۔ ادھر ہمارے ہاں رواج نہیں' سرحد میں' میں نے دیکھا ہے کہ مرنے والے کی قبر کے اوپر چالیس دن رات حافظ بیٹھتے ہیں' چالیس دن اس کی قبر پہ بیٹھ کر قرآن پڑھتے رہتے ہیں۔ شاید اس پہ تو آپ کبھی دل میں ہنسیں کہ صاحب! یہ کیا کرتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ یہ جو ہم ویسے سانس لینے والے مُردے ہیں' ساری عمر ہم قرآن نہیں پڑھتے اور ہمیں نہیں سنایا جاتا۔ کیا فرق پڑتا ہے وہ جو قبر کے اوپر بیٹھے ہوئے پڑھ رہے ہوتے ہیں اس مُردے میں اور ہم میں' جو ہمیں زندہ انسانوں کو سنایا جاتا ہے؟ یہ کہتے ہیں کہ ثواب ہوتا ہے۔ ان کا بھی ایمان ہے کہ ثواب ہوتا ہے۔ ثواب نہ آپ دکھا سکتے ہیں' نہ وہ دکھا سکتے ہیں۔ وہاں تو آپ ہنس دیں گے کہ صاحب! مُردے کی قبر پہ قرآن پڑھ پڑھ کر چالیس دن سنایا جاتا ہے تو ہوتا کیا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ وہ بھی کہتے ہیں کہ ثواب ہوتا ہے' پڑھنے والوں کو ہی نہیں' مُردے کو بھی ثواب ہوتا ہے۔ یہی ثواب آپ کہتے ہیں کہ قرآن کی تلاوت کرنے سے ہوتا ہے' ناظرہ پڑھنے سے بھی ثواب ہوتا ہے' یہ بھی نہ ہو تو اس کے اوپر انگلی پھیر دو۔ پوچھا جاتا ہے کہ کیا ہوتا ہے؟ یہی کہتے ہیں کہ ثواب ہوتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ثواب ہوتا ہے تو پھر ہنستے ہیں' آپ روز کہتے ہیں کہ اس سے ثواب ہوتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ لِيُنْذِرَ مَنْ كَانَ حَيًّا (36:70) یہ ضابطۂ حیات

---

[1] شعراء میں شیخ علی حزیں نے یہ کہا تھا۔

[2] حوالہ اقبال نامہ۔ جلد اول' ص۔ 78۔

تجھے‘ اے رسول! اس لیے دیا گیا ہے تا کہ تو اس کے ذریعے اس قوم کو جس میں حرارتِ حیات ہو اور وہ زندہ بھی رہنا چاہے‘ غلط روشِ حیات کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر دے۔ اب اس سے اگلا فقرہ کپکپا دینے والا ہے کہ **وَّيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ** (36:70) اور اس کی تعلیم سے انکار کرنے والوں کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ جو ایسا ہو‘ وہ سچ ہو کر سامنے آجاتا ہے تا کہ وہ دیکھ لے کہ ہم نے جو کچھ کہا تھا وہ کس طرح حقیقت ثابتہ تھا‘ شاعری نہیں تھا۔ یحق کے معنی ہوتا ہے ’’کسی چیز کا محسوس طور پر سامنے آجانا‘‘۔ قول تو ایسا ہے جسے آپ کہہ سکتے ہیں کہ صاحب! ممکن ہے کہ ہو یا نہ ہو لیکن اس قول کی صداقت محسوس طور پر سامنے آجاتی ہے اس لیے قرآن دیا گیا ہے۔ اور کہا ہے کہ یہ شاعری نہیں ہے۔

حیوانی سطح پر زندگی گزارنے کے نتیجہ میں انسان خود حیوان بن کر رہ جاتا ہے

عزیزانِ من! سوچو تو سہی‘ یہ شاعری نہیں ہے۔ اس کے بعد ایک آیت آتی ہے۔ سطحی طور پر دیکھنے کے بعد بظاہر یوں عامیانہ سی معاذاللہ نظر آتی ہے لیکن اس کے اندر بڑی عظیم حقیقت پوشیدہ ہے۔ دیکھتا ہوں‘ اتنا وقت ہے یا نہیں کہ بات ہو جائے۔ بات تو آسان سی ہے۔ کہا ہے کہ **اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّا خَلَقْنَا لَهُمْ مِّمَّا عَمِلَتْ اَيْدِيْنَآ اَنْعَامًا فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ . وَذَلَّلْنٰهَا لَهُمْ فَمِنْهَا رَكُوْبُهُمْ وَمِنْهَا يَاْكُلُوْنَ . وَلَهُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ اَفَلَا يَشْكُرُوْنَ** (36:71.73) کیا یہ اس چیز پہ غور نہیں کرتے کہ ہم نے ان کے لیے مویشی پیدا کیے۔ انعام جنہیں آپ حیوانات کہہ لیجیے‘ مویشی کہہ لیجیے‘ یہ پیدا کیے۔ اب اس نے بتایا یہ ہے کہ **فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ** (36:71) یہ ان کے اوپر حقِ ملکیت رکھتے ہیں۔ ملکیت کے معنی Possession نہیں ہوتا‘ یہ صرف کسی چیز کا مالک ہونا ہے۔ عربی زبان کی رو سے یہ ٹھیک ہے کہ جو چیز کسی کی Possession میں ہوتی ہے‘ وہ اس پہ پورا اقتدار اور اختیار رکھتا ہے‘ اس واسطے اس ملکیت کے لیے Possession کا لفظ آپ کے ہاں ہے۔ یہ کسی چیز کا مالک ہونا ہے‘ یہ اس کی شخصی ملکیت میں ہے‘ ورنہ ملکیت کے معنی ’’اختیار و ارادہ ہوتا ہے‘ قدرت ہوتا ہے‘ قبضہ ہوتا ہے‘‘۔ کہا ہے کہ ہم نے حیوانات پیدا کیے‘ مویشی پیدا کیے اور وہ انسانوں کے قبضۂ اختیار میں ہوتے ہیں‘ وہ انسانوں کی ملکیت میں ہوتے ہیں‘ انسان ان کا مالک ہوتا ہے۔ انسان‘ حیوانات کا مالک ہو جاتا ہے۔ غور فرمایا آپ نے! صرف حیوانوں کے متعلق ہی کہا ہے‘ کہ انسان ان کا مالک ہوتا ہے‘ ان پہ اختیار رکھتا ہے۔ یہ اختیار رکھنے کا جو میں نے ابھی عرض کیا ہے‘ اگلے لفظ میں اس کو واضح کر دیا ہے۔ کہا ہے کہ **مٰلِكُوْنَ وَذَلَّلْنٰهَا** (36:71.72) ان سے وہ کام لیتا ہے‘ وہ اس کے مطیع ہوتے ہیں‘ محکوم ہوتے ہیں‘ فرماں بردار ہوتے ہیں۔ اور یہ اتنی ہی چیز نہیں ہوتی۔ کیا لفظ ہے جو قرآن استعمال کرتا ہے! کہا ہے کہ **ذَلَّلْنٰهَا** (36:72) تذلیل بھی اس کے اندر ہوتی ہے۔ صرف محکومیت اور

فرماں برداری کے لیے بیسیوں الفاظ اور تھے چنانچہ عرب جو اس کا استعمال کرتے ہیں وہ **عَیْرُ الْمُذَلَّةِ** اس گدھے کو کہتے تھے جس پہ بوجھ بھی لادا ہوا ہو اور پیچھے سے ڈنڈے بھی پڑ رہے ہوں۔ یعنی فرماں برداری' محکومیت' کسی دوسرے کے مقصد کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بننا' اور پھر اس کے ساتھ ڈنڈے بھی پڑنا۔ حیوانات کی یہ کیفیت کہا ہے۔ تم اس کے اوپر سواری کرتے ہو' نچوڑ نچوڑ کر ان کا دودھ پی جاتے ہو' کھالیں کھینچ لیتے ہو' اور ان سے مختلف قسم کے کام لیتے ہو' ان کو کھا بھی جاتے ہو۔ کہا ہے کہ یہ چیز انسان' حیوانات کے متعلق کرتا ہے لیکن جہاں انسان دوسرے انسانوں کے متعلق یہ کچھ شروع کردے تو وہ ان کے خون کا آخری قطرہ بھی چوس لے گا۔ اس سے یہ ساری بات واضح ہوگئی کہ یہ شاعری نہیں ہو رہی۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ لوگ' وہ انسان جو انسانوں کی سی شکل وصورت تو رکھتے ہیں لیکن زندگی وہ حیوانات کی بسر کرتے ہیں۔ اب جتنے انسان وہ ہوں گے جن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ انعام کی زندگی بسر کرتے ہیں' حیوانی سطح کی زندگی بسر کرتے ہیں' ان کے اوپر یہ جو ساری چیزیں ہیں' ان کا اطلاق ہو جائے گا۔

حیوانی سطح زندگی کے اندر اقدار نہ ہونے کی وجہ سے شرفِ انسانیت باقی نہیں رہتا

انسان جو کچھ حیوانات کے ساتھ کرتا ہے' جب انسان خود حیوانی سطح کے اوپر زندگی بسر کرے گا تو پھر دوسرا انسان اس کے ساتھ یہی کچھ کرے گا جو کچھ حیوانات کے ساتھ کرتا ہے' جو کچھ انعام کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ اس کو محکوم بھی بنائے گا' فرماں بردار بھی بنائے گا' بوجھ بھی لادے گا' ذلیل بھی کرے گا' ڈنڈے بھی مارے گا' چوس کر اس کے خون کا ایک ایک قطرہ لے جائے گا' ان کو کھا بھی جائے گا اس لیے کہ یہ انسان نہیں رہے' قرآن کہتا ہے کہ یہ **انعام** ہو گئے۔

عزیزانِ من! یہ دنیا میں ہو کیا رہا ہے؟ حیوانات کی سطح کے اوپر زندگی بسر کرنے والے یہاں میں صرف دو مقام سامنے لاتا ہوں کہ وہ کون انسان ہیں؟ کہا ہے کہ **وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ** **(47:12)** جو لوگ اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں تو ان کی زندگی اور حیوانات کی زندگی میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ وہ انہی کی طرح کھاتے پیتے ہیں سامان زیست سے فائدہ اٹھاتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اس تصورِ زندگی کا نتیجہ شرفِ انسانیت کی تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ حیوانوں کی طرح جیسے اور حیوانوں کی طرح مر گئے۔ انسانی سطح زندگی ان کے نصیب میں ہی نہیں ہوتی۔ یہاں حیوانی سطحِ زندگی کا کہا ہے۔ حیوان کی زندگی آپ کو معلوم ہے کہ کھانا پینا' افزائشِ نسل کرنا اور مر جانا ہے۔ یہی حیوانی زندگی ہے۔ کھانے پینے میں اقدار یا **Values** کا کوئی تصور نہیں ہوتا۔ جہاں سے ملے اور پھر جو چارہ ڈالے' جو جی میں آئے اس سے وہ کام لیتا جائے' اس کو تو اپنے چارے سے غرض ہوتی ہے۔ حیوانی سطحِ زندگی کے اندر شرفِ انسانیت نہیں ہوتا' اقدار یا **Values**

نہیں ہوتیں۔ میں پھر دو لفظوں میں سمجھا دوں کہ جب بیل اپنے ہاں گاؤں سے نکلتا ہے تو جو کھیت سامنے آتا ہے وہ اسی میں منہ مار دیتا ہے' اسی میں کھانا شروع کر دیتا ہے۔ اس میں یہ تمیز نہیں ہوتی کہ یہ میرے مالک کا کھیت ہے یا کسی غیر کا ہے' جائز ہے اس میں سے کھانا یا ناجائز ہے' حلال ہے یا حرام ہے۔ اس کی تمیز نہیں ہوتی۔ یہ حیوانی سطحِ زندگی ہے۔ انسان کی زندگی کی سطح یہ ہے کہ اس میں Value ہوتی ہے' جائز اور ناجائز' حرام اور حلال کی تفریق ہوتی ہے' اسے Value کہتے ہیں۔ یہ انسانی سطح کی چیز ہے' حیوانی سطح کی نہیں ہے۔ حیوانی سطح میں کھانا پینا' جیسے ملے جہاں سے ملے' جس طریق سے ملے' افزائشِ نسل کرنا جس طرح سے بھی ہو' اس کے بعد مر جانا۔ یہ ان انسانوں کی سطح زندگی ہے جو حیوانی زندگی بسر کرتے ہیں اور پھر جہنم میں رہتے ہیں۔

حیوانی سطح پر زندگی گزارنے والے آنکھیں' کان اور دماغ تو رکھتے ہیں مگر نہ وہ دیکھتے ہیں' نہ سنتے ہیں اور نہ ہی وہ سوچتے ہیں

ایک تو قرآن نے یہ بتایا کہ جو اقدار کی پابندی نہیں کرتے' ان کا احساس نہیں رکھتے' ان کے نزدیک Values (اقدار) کچھ نہیں ہوتیں' وہ حیوانی سطح کی زندگی ہوتی ہے' حیوان ہوتے ہیں۔ دوسرا اس نے بتایا کہ **لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا وَ لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ**(7:179) وہ انسان آنکھیں رکھتے ہیں' ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے' کان رکھتے ہیں ان سے سننے کا کام نہیں لیتے' دل و دماغ رکھتے ہیں سمجھنے سوچنے کا کام نہیں لیتے' یہ حیوان ہیں بلکہ ان سے بھی بدتر ہیں۔ اب یہ دو چیزیں آ گئیں۔ ایک تو وہ انسان جو سمجھ' سوچ' سماعت' غور' فکر' شعور' عقل' تدبر سے کام نہ لیں حیوانی سطح پہ زندگی بسر کریں اور دوسرے وہ جن کے سامنے Values یا اقدار نہ ہوں' محض کھانا پینا ہو۔ قرآن کہتا ہے کہ جب کوئی قوم اس سطح کے اوپر اتر آتی ہے' تو جس طرح سے پھر کوئی انسان جوان سے زیادہ طاقت رکھتا ہے' زیادہ قوت رکھتا ہے' جس طرح سے وہ گدھوں کے ساتھ کرتا ہے' بیلوں کے ساتھ کرتا ہے' گائیوں کے ساتھ کرتا ہے' وہ پھر ان انسانوں کے ساتھ بھی یہی کچھ کرتا ہے۔ انسانیت کی سطح کے اوپر تو اس نے کہا ہے کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے کہ **مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ**(3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں ہے خواہ وہ قوانین سازی کے اختیار کیوں نہ رکھے' وہ Executive کے اختیارات کیوں نہ رکھے' وہ نبی بھی کیوں نہ ہو جائے کہ وہ کسی دوسرے انسان سے کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ۔ یہ کسی کو حق حاصل نہیں ہے۔ **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ**(17:70) ہر انسانی بچہ انسان ہونے کی جہت سے یکساں واجب التکریم ہے۔

حیوانی سطح پر انسان سے انسان کا واسطہ ہمیشہ ذلت آمیز سلوک کی شکل میں ہی ظاہر ہوتا ہے

مقامِ انسانیت یہ ہے کہ اگر وہ انسان ہے تو کوئی انسان دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنا ہی نہیں سکتا لیکن جب وہ انسانی سطح سے نیچے اتر کر حیوانی سطح پہ آجائے تو انسان جو کچھ حیوان سے کرتا ہے' زیادہ قوت والے انسان ان سے وہی کچھ کریں گے۔ قرآن نے بتا دیا اس سطح کے اوپر اترنے والوں کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ عزیزانِ من! بنی اسرائیل کی داستان میں ہے' یہ مقامات بڑے غور سے سننے کے ہیں۔ معلوم نہیں پھر ان کے دہرانے کا اتفاق ہو یا نہ ہو۔ کہا کہ جب وہ قوم حیوانی سطح کے اوپر اتر گئی' Values (اقدار) نہ رہیں' ان کے اندر شرفِ انسانیت نہ رہا تو کہا ہے کہ فَاِذَا جَآءَ وَعۡدُ اُوۡلٰهُمَا بَعَثۡنَا عَلَيۡكُمۡ عِبَادًا لَّنَاۤ اُولِىۡ بَاۡسٍ شَدِيۡدٍ فَجَاسُوۡا خِلٰلَ الدِّيَارِ (17:5) جب وہ اس سطح کے اوپر اتر گئی تو ایسے انسان جن کی Qualification (لیاقت) اس سے کچھ زیادہ تھی کہ ان کے پاس سامانِ حرب وضرب زیادہ تھا' قوت زیادہ تھی' وہ ان سے زیادہ جنگجو تھی۔ وہ ان کے اوپر چڑھ دوڑے اور پھر انہوں نے گھر گھر میں گھس کر ان کو اتنا عذاب دیا جو جہنم کا عذاب ہوتا ہے' انسان حیوانوں کے ساتھ بھی وہ کچھ نہیں کرتا جو ان انسانوں کے ساتھ انہوں نے کیا۔ یہاں اولی باس شدید (7:5) کہا ہے یعنی کسی اور بات میں وہ ان سے زیادہ اونچے نہیں تھے' وہ خود انسانیت کی سطح پہ ہوتے تو یہ لاکھ حیوان کی سطح پہ چلے گئے تھے وہ ان کے ساتھ یہ کچھ نہ کرتے۔ اُن کی Qualification (لیاقت) اتنی تھی کہ ان کے پاس بڑی قوت تھی' بڑا سامان تھا' لڑائی میں یہ ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔

قومِ عاد کی تباہی کی بنیادی وجہ ان کی حیوانی سطح زندگی تھی

دوسرے مقام پہ قومِ عاد کے متعلق ہے' قومِ عاد کی تباہی کے متعلق ہے۔ یاد رکھیے! قرآنِ کریم' یہ جو قومیں تباہ ہوئی ہیں' ان کے متعلق بتاتا ہے کہ یہ حیوانی سطح کے اوپر اتر گئی تھیں۔ پھر کیا ہوا؟ سنو! کہا کہ وَ تِلۡكَ عَادٌ (11:59) ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کے سرہانے کھڑے ہو کر جیسے بات کرتا ہے' قرآن یوں کرتا ہے کہ یہ ہیں وہ عاد' اتنی بڑی شان وشوکت کے مالک جو کبھی تھے' کیا ہوا انہیں؟ جَحَدُوۡا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمۡ وَ عَصَوۡا رُسُلَهٗ (11:59) اقدارِ خداوندی سے سرکشی برتی' خدا کے رسولوں نے آ کر ان کو انسانیت کا صحیح راستہ دکھانا چاہا' انہوں نے ان کی مخالفت کی تو اس کے بعد پھر ہوا کیا؟ وَ اتَّبَعُوۡۤا اَمۡرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيۡدٍ (11:59)۔ جبار بمعنی جبر اور قہر کے مالک' جو لوگ تھے' پھر یہ ان کے احکام کے فرماں بردار ہو گئے' جس طرف انہوں نے کہا اس طرف چلنا شروع ہو گئے۔ وہاں باس شدید (17:5) کہا تھا یعنی Qualification (لیاقت) اتنی تھی' قوت زیادہ تھی' یہاں بھی کہا کہ جَبَّارٍ عَنِيۡدٍ (11:59) جبر کرنے والے' سرکش انسان جو کوئی قاعدہ ملحوظ نہ رکھیں' جو کچھ وہ کہیں وہی ان کا قاعدہ اور

قانون بنے' یہ ان کے تابع فرمان ہو گئے۔

قوموں کی طرف سے قوانین کی سرکشی کا نتیجہ اختیار و ارادہ سے محرومی کی شکل میں نکلتا ہے

عزیزانِ من! یہ کچھ ہوتا ہے جب انسان حیوانات کی سطح پہ اتر آتا ہے۔ یوں ہی انسان' انسان کے قابو نہیں آتا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ انسان رہتے ہی نہیں ہیں' وہ انہیں محکوم بنا لیتے ہیں۔ جسے میں نے محکومیت کہا ہے' دوسری جگہ قرآن نے یہ لفظِ مملوک استعمال کیا ہے یہاں مالک کہا ہے۔ مملوک وہ ہے جس کے اوپر مِلک آجائے۔ اور یہاں واضح کر دیا کہ یہ جو مملوک ہے' جس کا مالک کوئی دوسرا ہو جائے اس کی یہ تفسیر کر دی۔ اب سوال یہ ہے کہ مملوک کیا ہوتا ہے؟ اس کی کیسی صورت ہوتی ہے؟ کہا ہے کہ **ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ** (16:75)۔ پہلے عبد بھی کہا' پھر کہا کہ غلام ہی ہو گیا۔ مملوک کہا ہے۔ یہ ہے لفظ جو میں نے کہا تھا۔ مملوک کون ہو جاتا ہے؟ وہ کہ جو کسی چیز کا اختیار ہی نہیں رکھتا ہو۔ حیوانات خود کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتے' یہ جو ان کا مالک ہوتا ہے' وہ اس کے مقاصد کو بروئے کار لانے کا ذریعہ بنتے ہیں' ان کا کوئی اپنا مقصد نہیں ہوتا' اپنا اختیار نہیں ہوتا۔ صبح اٹھے' اس نے گھوڑے کو ٹانگے میں جوت لیا۔ اختیار مالک کا ہے' یہ مملوک ہے' اس کا کوئی اختیار نہیں ہے' جوت لیا ہے۔ اُس کا جی چاہے تو اس کو وہ مال روڈ کی طرف لے جائے' اس کا جی چاہے تو اس کو گلبرگ کی طرف لے جائے۔ یہ اس گھوڑے کے اختیار میں ہی نہیں ہوتا کہ وہ کہے کہ نہیں صاحب! آج تو ہم گلبرگ جائیں گے' مال روڈ کی طرف نہیں جائیں گے۔ وہ یہ کہہ ہی نہیں سکتا۔ وہ کہتا ہے جس کے ہاتھ میں اس کی لگام ہوتی ہے' جس کے ہاتھ میں ہنٹر ہے' جس کے ہاتھ میں چابک ہے' جس کے ہاتھ میں وہ ڈنڈا ہے' وہ اسی کا محکوم ہے' مملوک ہے۔

محکوم قوموں کی حالت اس گدھے کی سی ہوتی ہے جو مالک کا بوجھ بھی اٹھاتا ہے اور پھر اس سے ڈنڈے بھی کھاتا ہے

میں نے کہا تھا کہ یہ لفظ **ذللنٰھا** قرآن نے استعمال کیا ہے۔ اس کے اندر دونوں چیزیں ہوتی ہیں۔ وہ گدھا جس پہ بوجھ بھی لادا ہوا ہو اور پھر وہ پیچھے سے اس کو چابک بھی پڑ رہے ہوں۔ وہ صاحبِ اختیار ہوتا ہے' یہ صاحبِ اختیار نہیں ہوتا۔ مملوک کے معنی ہی یہ ہیں کہ جس کا اختیار نہ رہے۔ کہتا ہے قومیں جب حیوانات کی سطح کے اوپر اتر آتی ہیں' **انعام** کی سطح پہ اتر آتی ہیں' تو جو کچھ پھر ہر وہ شخص جس کے ہاتھ میں کچھ قوت ہوتی ہے' جو کچھ وہ حیوانات کے ساتھ کرتا ہے' وہ پھر ان انسانوں کے ساتھ یہی کچھ کرتا ہے۔ جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ کوچوان کے گھوڑے کا' تانگے کے گھوڑے کا' اپنا کوئی مقصد نہیں ہوتا' اختیار بھی نہیں ہوتا کہ جی چاہے

جائے اور جی چاہے نہ چلے۔ نہ چل کر ذرا دیکھے تو سہی' پھر اس کی مرضی کے مطابق نہ چلنے والے کا حشر کیا ہوتا ہے اور اس کا اپنا کوئی مقصد نہیں ہوتا۔ یہ جو صاحبِ اختیار ہیں' اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنا مقصد آپ متعین کریں۔ یاد رکھیے! دوسرے کے مقصد کے بروئے کار لانے کا اگر انسان ذریعہ بنتا ہے تو وہ صاحبِ اختیار نہیں ہے۔ یہ شے ہوگیا' چیز ہوگیا یہ حیوان ہوگیا' یہ مویشی ہوگیا' یہ انسان نہیں رہا۔ انسان صاحبِ اختیار کے معنی یہ ہیں کہ یہ خود اپنا مقصد رکھتا ہو۔ وہ کیا بات کہہ گیا ہے!

یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحبِ مقصود
ہزار گونہ فروغ و ہزار گونہ فراغ!

(اقبالؒ: بال جبریل)

انسان کی پہچان یہ ہے کہ وہ اپنی ذات میں اپنے اختیار کا خود مالک ہوتا ہے

اپنا مقصد آپ متعین کرتا ہے تو انسان کہلانے کا حق رکھتا ہے' اس کے مقاصد کوئی اور متعین کرتا ہے تو حیوان کی سطح کے اوپر اتر آتا ہے' انسان نہیں ہے تانگے کا گھوڑا ہے' کسان کا بیل ہے' کمہار کا گدھا ہے' انسان نہیں ہے۔ انسان اپنا مقصد آپ رکھتا ہے۔ تعاون اور بات ہوتی ہے۔ جو تعاون ہے' یہ تو خود عربی جاننے والے' گرامر جانتے ہیں' یہ جو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے' ایک دوسرے کی مدد کرنا' یہ تو معاشرے کی ضروری چیز ہے۔ درزی بیمار ہوتا ہے تو ٹھیک ہے وہ ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے' وہ اس کی مدد کرتا ہے' ڈاکٹر نے کپڑے سلانے ہوتے ہیں' وہ درزی کے پاس آتا ہے یعنی یہ باہمی تعاون ہے۔ قرآن نے انسانوں کی زندگی میں باہمی تعاون کہا ہے۔ اس نے یہ نہیں کہا ہے کہ کسی ایک انسان کے مقاصد کو دوسرے پورا کریں جس میں ان کا اپنا کوئی ارادہ نہ ہو' اپنا کوئی اختیار نہ ہو' اپنا کوئی مقصد نہ ہو' وہ اس سے اپنے مقاصد کو پورا کرتا چلا جائے۔ یہ جو چیز قرآن نے کہی ہے کہ **فَهُمْ لَهَا مٰلِكُوْنَ** (36:71) یہ انسان ہیں' حیوانات کے اوپر ان کی کیفیت یہ ہوگی کہ یہ اونٹ کے اوپر صاحبِ اختیار بنیں۔ صاحبِ اختیار یہ ہیں۔ اُن کا اختیار سلب ہوگیا اُن کا اپنا کوئی Purpose (مقصد) نہ رہا' اس کا Purpose (مقصد) ہوگیا اور اس کے ساتھ پھر **وَذَلَّلْنٰهَا** کہا ہے کہ پھر وہ ان کو ذلیل بھی کرے' کام بھی لے' اور ذلیل بھی کرے۔ کیسے؟ کہا کہ **رکوبھم** (3:72) ان کے اوپر سواری کرے' **مَشَارِبُ** (36:73) یہ تو دودھ ہی پیتے ہیں' خون نچوڑ نچوڑ کر پی جاتی ہیں' **فِيْهَا مَنَافِعُ** (36:73) اور مختلف قسم کے اپنی منفعت کے کام ان سے کراتا چلا جائے **يَاْكُلُوْنَ** (36:72) ان کو کھا بھی جائے' کچھ نہ چھوڑے۔ انسانوں کو جب حیوانی سطح کے اوپر سمجھے تو یہاں کیفیت یہ ہوتی ہے۔

قرآنِ حکیم میں مالک کا لفظ جہنم کے داروغے کے لیے آیا ہے

عزیزانِ من! یہی ہے وہ چیز جسے قرآن نے انسانوں کے اوپر کوئی مالک بتایا ہے۔ میں نے کہا ہے کہ وہ ان کو انسان تو کہتا نہیں ان کو تو حیوان ہی کہتا ہے۔ مالک کا لفظ ان کے لیے آیا ہے۔ جہنم کے داروغے کا نام بھی مالک ہے۔ اف! جہاں دروازے کے اوپر کوئی مالک کھڑا ہو کہ اس کے ہاتھ میں اختیارات ہوں اور ان کے کسی اختیار میں نہ ہوں قرآن اسے جہنم کہتا ہے۔ جہنم کے اندر وہ کہتا ہے کہ وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ لِيَقْضِ عَلَيْنَا رَبُّكَ (43:77)۔ جہنم کی زندگی میں نے کہا تھا قرآن کہتا ہے کہ اس میں نہ زندگی ہوگی نہ موت ہوگی چاروں طرف سے موت آتی دکھائی دے گی لیکن یہ مریں گے بھی نہیں۔ یہاں وَنَادَوْا يٰمٰلِكُ کہا ہے۔ یہاں يٰمٰلِكُ لفظ آیا ہے وہ جہنم کے داروغے کا ہے۔ یہ جہنم کے داروغے سے کہیں گے کہ اے مالک! خدا سے کہو کہ کسی طرح سے ہمارا خاتمہ ہی کر دے اس عذابِ مسلسل سے تو ہم چھوٹ جائیں۔ وہ کہے گا کہ نہیں! قَالَ اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ (43:77) یہ تو عمر بھر کی قید ہے۔ تو مالک کا لفظ جو آیا ہے انسانوں کے لیے جہنم میں آیا ہے۔ اور دوسری جگہ دیکھیے مالک انسانوں کے اوپر۔ عزیزانِ من! بڑے غور سے ان چیزوں کو سنتے جایئے گا اور لکھتے چلے جایئے یہ چیزیں آپ کے بڑے کام آئیں گی۔

کسی نبی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدا کے حکم کی اطاعت کے علاوہ انسانوں سے کہے کہ میرے بندے بن جاؤ

سارے قرآن میں یہ کہیں نہیں ہے کہ اس میں کوئی انسان دوسرے انسان کے لیے ''مالک'' کا لفظ لائے۔ میں نے کہا ہے کہ وہ تو Executive Officer ہے نبی تک کے لیے بھی یہ حکم نہیں دیتا۔ اس کو صرف یہ کہنے کا حق حاصل ہے کہ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كونوا رَبّٰنِيّٖنَ (3:78) وہ لوگوں کو یہ کہے کہ تم اس کے نظامِ ربوبیت کے علمبردار بن جاؤ (بانی بن جاؤ) انسانوں کے لیے سوال ہی نہیں کسی انسان کا مالک ہو جانا۔ مالک کون ہے؟ سارا قرآن پوری تعلیم دینے کے بعد تربیت دینے کے بعد آخری آیت میں کہتا ہے کہ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ . مَلِكِ النَّاسِ (114:1.2) انسانوں کے اوپر جو حقِ اختیار ہے وہ صرف خدا کا ہو سکتا ہے۔ غور فرمایا آپ نے کہ کتنی عظیم چیز ہے جو قرآن کہہ گیا ہے کہ اگر انسانوں پر انسانوں کا اختیار چلتا ہے اس کی قوت چلتی ہے وہ اس کی ملکیت ہو جاتے ہیں تو ان انسانوں کو سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کی رو سے ہماری زندگی سطحِ انسانیت کی نہیں ہے حیوانیت کی زندگی ہے۔ قرآن نے کہا تھا کہ اس قسم کے لوگ ان کے اوپر آ کر مسلط ہو جاتے ہیں۔ آگے جب سامنے انسان ہی بستے ہوں تو انسان تو انسان کے اوپر مسلط ہی نہیں ہوتے۔ ان کی صورت یہی کہ

شامتِ اعمال ما صورتِ نادر گرفت

نادر نے تو تباہی مچائی تھی۔ اس کے لیے کہا تھا کہ وہ کہیں باہر سے نہیں آیا تھا' ہمارے اپنے اعمال کی جو شامت تھی' اس نے نادر کی شکل اختیار کر لی تھی۔ قومیں خود ہی جب اپنے آپ کو اس سطح پہ لے آئیں' تو وذللنٰھا ہوتا ہے' جو قرآن نے کہا ہے کہ خود ہی ذلت کی زندگی بسر کریں۔ میں نے بتایا ہے قرآن نے بنی اسرائیل کے متعلق کہا ہے کہ پھر اس قسم کے وہ جبار اور اُولُوْا قُوَّةٍ وَّاُولُوْا بَاْسٍ شَدِيْدٍ (27:33) بڑی قوتوں کے مالک' ان کے اوپر مسلط ہوئے تو کہا کہ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ (26:130) جب تم کسی کو پکڑتے ہو تو نہایت مستبدانہ انداز سے پکڑتے ہو' اس طرح کہ وَ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ وَ الْمَسْكَنَةُ وَ بَآءُ وْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ (2:61) اُن پر ذلت وخواری کا عذاب خداوندی مستولی ہو گیا۔ ان کی ذلت ہوئی' تذلیلِ انسانیت ہوئی اور شرفِ انسانیت سے محرومی ہوئی۔ شرفِ انسانیت کیا ہے؟ یہ اختیارِ انسانیت ہے' یہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدود کے اندر جو اس نے اختیار دیا ہے' وہ ہے۔ وہ اختیار کیوں؟ اس لیے کہ وہ مَلِكِ النَّاسِ (114:2) ہے۔ انسانوں پر اختیار اور ملکیت کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور میں نے جیسا کہا ہے جو سارا قرآن ہے اس نے پوری تعلیم دینے کے بعد ایک ہی جگہ کہا ہے کہ اِلٰهِ النَّاسِ (114:3) بھی وہی ہے لیکن اس کو یہ حق اس لیے حاصل ہے کہ وہ رَبِّ النَّاسِ (114:1) ہے' وہ ان کا خون نہیں چوستا' ان کا گوشت نہیں کھاتا' ان کی کھال نہیں کھینچتا۔ وہ رَبِّ النَّاسِ (1114:1) ہے' ان کی ربوبیت کرتا ہے اور ربوبیت کے اعتبار سے پھر کہا کہ مَلِكِ النَّاسِ (1114:2) ہے' اِلٰهِ النَّاسِ (1114:3) صاحبِ اقتدار بھی ہے' اختیار وارادہ بھی اسی کو ہے' ربوبیت بھی وہ کرتا ہے۔ لیکن جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ الناس کے متعلق جو ملک ہے' ملکیت ہے' وہ یا تو یہ محکوم قوموں کے اوپر دوسرے قسم کے انسان آجاتے ہیں اور وہ دوسری قسم کے انسان بھی یوں کہیے کہ بس وہ بھی ایک حیوانی سطح کے اوپر ہوتے ہیں۔ ایسے سمجھیے جیسے جنگل کے اندر ہرن بھی ہوتے ہیں اور بھیڑیا اور شیر بھی ہوتا ہے' ہوتے تو دونوں ہی حیوانی سطح پہ ہیں' بات تو صرف یہ ہے۔ کوئی انسان تو اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ دوسرے انسان کو ذلیل کرے۔

انسانیت کی برومندی کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ کے دور کا ایک واقع

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہوگا جو میں سنایا کرتا ہوں کہ حضرتِ عمرؓ کے زمانے میں (634.644/45ء) جو گورنرِ مصر [1] تھے' انہوں نے ایک ذمی یہودی کو' غصے میں آکر کہہ دیا کہ خدا تجھے ذلیل کرے۔ یہ کہہ تو دیا اور اس کے بعد سوچا پھر سیدھے بابِ خلافت

---

[1] وہ حمص کے حاکم' حضرت عمیر بن سعدؓ تھے۔ ان کے منہ سے کسی ذمی کے متعلق یہ الفاظ نکل گئے۔ اخزک اللہ خدا تجھے رُسوا کرے (حوالہ پرویزؒ: شاہکارِ رسالت' ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 1987' ص۔ 325)۔

میں آ گئے اور اپنا استعفیٰ داخل کر دیا۔ اس میں یہ لکھ دیا کہ میں نے ایک انسان کی تذلیل کی ہے اور میں اس کا حق نہیں رکھتا کہ ملک کے کسی منصب کے اوپر میں چلا جاؤں' میں تو شرفِ انسانیت سے گر گیا ہوں۔ انہیں بہتیرا سمجھایا کہ بات یوں ہی زبان سے نکل گئی' کہنے لگے کہ سوال ہی نہیں! کوئی اور بول پڑتا تو اس کو معافی مل سکتی تھی' کسی انسان کے متعلق یہ کہنا کہ تم ذلیل ہو یا خدا تمہیں ذلیل کرے' اس کی معافی نہیں مل سکتی اور میرے جیسا ذلیل جو ایک انسانیت کی سطح پہ نہیں ہے' تم گورنر کہتے ہو' میں تو اپنے آپ کو تمہاری رعایا کے برابر بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اللہ اکبر! اگر یہ انسان ہوں تو کیا یہ پھر ان کو حیوان سمجھیں گے؟ بالکل نہیں' اس کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ وہ بھی اسی لیے قرآن نے **باس شدید** کہا ہے یعنی ان کے اندر اتنی بات تھی کہ یہ ہرن تھے' وہ بھیڑیئے تھے۔ وہ جوان کو جبار اور عنید **(14:15)** کہا ہے' کیا یہ انسانیت ہے؟ ایک جبار کا لفظ ہے جو اس قسم کے انسانوں کے لیے آئے جو قوانینِ خداوندی کی حدیں توڑ کر سرکش ہو جاتے ہیں۔ یہ مستبد' ظالم' سرکش اور حد سے بڑھ جانے والے ہیں۔ جب یہ انسان ہر شکستگی کو قوانینِ خداوندی کی **Splints** میں رکھ کر جوڑنے والے ہوں تو پھر جیسا میں نے کہا ہے کہ یہ مُردے کو پہلے زندہ کرتے ہیں' یہ جو انسان ہوتے ہیں یہ حیوانات کی سطح سے اٹھا کر انسانی سطح پہ لاتے ہیں' یہ ان کو ذبح نہیں کرتے' ذبح فرعون کرتا ہے' یہ ان کو ذبح نہیں کرتے' انسانوں کی سطح میں لاتے ہیں' ان کی زندگی کی سطح کو بلند کرتے ہیں۔ جب وہ زندہ ہوتے ہیں' انسان ہو جاتے ہیں' وہاں پھر قرآن کی شمع ان کے ہاتھ میں دیتے ہیں کہ تم اب جاؤ اور اس قرآن سے نوعِ انسانی کے راستوں کو روشن کرو۔ قرآن انہیں اس سطح کے اوپر لاتا ہے اور پھر ان کے ہاتھ میں قرآن دیا جاتا ہے۔

یوم الدین یعنی اسلامی مملکت کے نظامِ حیات کے خدوخال پر ہونے والی بحثیں

عزیزانِ من! آخری ایک چیز اور ہے اور وہ ہے **مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ 1:3)** کتنی ہی بار ہم اس کو دہراتے ہیں' کتنی ہی بار دہراتے ہیں! الدین کا اب ہمارے ہاں ترجمہ یا احساس یہ ہو گیا ہے کہ یہ نظامِ مملکت ہے۔ اتفاق سے آج کل اخبارات میں نظامِ مملکت کے متعلق بڑی بحثیں بھی چلی ہوئی ہیں کہ اسلامی مملکت کا نظام کیا ہو گا؟ میں اس بحث میں نہیں جاتا لیکن بحث میں ہو کیا رہا ہے؟ یہ کہ کیا اس میں پارلیمنٹری نظام ہو گا یا **Presidential System** (صدارتی نظام) ہو گا؟ غلام قوم کی جو فکر ہے' وہ بھی غلام ہوتی ہے۔ چونکہ یہ دو ہی نظام ہیں' ایک انگلینڈ میں ہے' ایک امریکہ کا ہے' جو بحث ہے وہ صرف ان دونوں کے گرد چلتی ہیں پھر یہ نظام بھی ذہن میں ہی نہیں آتا۔ او کم بختو! وہ بُرا ہی سہی ناقص نظام ہی کہو کم از کم مستعار تو نہ لو۔ بحث ہی اس میں ہوتی ہے کہ پارلیمنٹری نظام اچھا ہے یا صدارتی نظام اچھا ہے؟ عزیزانِ من! غلامی کی ذہنیت ہے' سوچ ہی نہیں سکتے' افکارِ تازہ تو آ ہی نہیں سکتے

لیکن بہرحال بحث چلتی ہے ہمارے ہاں۔ انہی میں الدین ڈھونڈ رہے ہوتے ہیں اور یہ بھی کہ الیکشن کا طریقہ کیا ہوتا ہے؟ ووٹنگ کا حق کس کو ہوتا ہے؟ Qualification کس قسم کی ہیں؟ الدین میں نے کہا ہے کہ الدین کا ترجمہ نظام ہوگیا۔ یہ بڑا صحیح ہوا ہے۔ قرآنِ کریم نے مٰلِکِ یَوۡمِ الدِّیۡنِ(1:3) کہا ہے۔ اب بات سمجھ میں آ گئی کہ نظامِ خداوندی کا جو دور ہوگا' اس میں انسانوں کے اوپر صاحبِ اختیار کوئی انسان نہیں ہوگا' صرف خدا ہوگا۔ اب یہاں یہ جو بات تھی وہ مختصر کہی گئی' دوسری جگہ اس کی تفصیل کر دی' قرآن نے خود وضاحت کر دی' کہا کہ وَمَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ(82:17) تم روز کہتے ہو' ہر رکعت میں ہر الحمد شریف کے اندر مالک یوم الدین کہتے ہو' کیا ہے یہ یوم الدین؟ تمہیں خدا کے سوا کون بتائے گا کہ یوم الدین کیا ہے' تمہیں اس کے سوا کون بتائے گا کہ نظامِ خداوندی' نظامِ اسلامی مملکت کیا ہے؟ وہ بتائے گا ثُمَّ مَاۤ اَدۡرٰىكَ مَا يَوۡمُ الدِّيۡنِ(82:18) اتنا اہم ہے کہ پھر کہا کہ کوئی اور نہیں بتا سکے گا' صرف ہم بتائیں گے کہ وہ جو نظام ہے جسے تم نظامِ خداوندی کہتے ہو' اس کی خصوصیت کیا ہوگی؟ کسے کہہ سکتے ہو؟ کہا کہ يَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا ؕ وَالۡاَمۡرُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ(82:19) جس دور میں کسی انسان کا دوسرے انسان پہ کوئی اختیار نہیں ہوگا' سارے اختیارات خدا کے ہوں گے۔ یہ ہے نظامِ مملکت اسلامیہ جس میں يَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا ؕ وَالۡاَمۡرُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ (82:19) یہ ہے وہ جس میں ہر انسان اپنے اپنے اعمال کو اپنے سامنے دیکھے گا۔ کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔ نہ ہی کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اختیار و اقتدار ہوگا۔ اور اختیارات' تمام کے تمام' قوانینِ خداوندی کے لیے مختص ہونگے۔ حکومت صرف ان قوانین کی ہوگی' کسی اور کی نہیں ہوگی۔ بحث کرنے والوں سے کہو کہ خدا کے لیے اس خدا سے تو پوچھ لو کہ تمہارا جو نظام ہے' اس کی خصوصیتِ کبریٰ' اس کی انفرادیت کیا ہے؟ یہ ہے اس کی انفرادیت کہ يَوۡمَ لَا تَمۡلِكُ نَفۡسٌ لِّنَفۡسٍ شَيۡـًٔا ؕ وَالۡاَمۡرُ يَوۡمَئِذٍ لِّلّٰهِ (82:19)۔

عزیزانِ من! اب زیادہ کچھ کہنے کی ہمت بھی نہیں رہی۔ ہم سورۃ یٰسٓ کی آیت 73 تک آ گئے ہیں' 74 سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ؕ

چھٹا باب : سورۃ یٰسٓ (آیات 74 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزیزانِ من ! آج پندرہ اگست 1980ء ہے۔ سابقہ درس گیارہ جولائی کو ہوا تھا' چار درسوں کا ناغہ رہا' آج پھر سلسلۂ کلام شروع ہو رہا ہے۔

15 اگست 1947ء کے دن کی اہمیت اور اس دور کے کچھ تاریخی حقائق

آج پندرہ اگست کئی اعتبار سے اہم بھی ہے اور اس کے ساتھ ہماری بڑی یادیں وابستہ ہیں جو مسرت بار بھی ہیں اور جگر خراش بھی۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ یہ جشنِ نزولِ قرآنِ کریم' جسے عرفِ عامہ میں عید الفطر کہا جاتا ہے' اس سے ملحقہ یہ تاریخ آئی ہے۔ پرسوں عید تھی' میں آپ احباب کی خدمت میں دلی ہدیۂ مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ پندرہ اگست ہمارا یومِ آزادی بھی ہے۔ اس اعتبار سے دوسری بار آپ کی خدمت میں مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ پندرہ اگست 1947ء 33 سال کا عرصہ ہوا شمسی اور قمری کلینڈر میں جو تھوڑا سا فرق آتا ہے اس اعتبار سے یہی دو چار دن کا فرق ہے ورنہ لوٹ پلٹ کر جو کہتے ہیں کہ زمانہ پھر سے وہیں آ گیا' 33 سال کے بعد وہی یہ دن آ گئے۔ 14 اگست کو پاکستان کی تشکیل یا اس کی آزادی یا ہندوستان سے اس کی علیحدگی کا اعلان ہوا تھا اور پندرہ

اگست ہمارا پہلا یومِ آزادی تھا۔ یہ اس اعتبار سے بھی بڑا سعادت مند دن ہے کہ وہ رمضان المبارک کی ستائیسویں تھی' جمعۃ الوداع تھا' آزادی کا پہلا دن تھا اور اس کے بعد اٹھارہ اگست کو آزاد مملکت میں پہلی عید تھی۔ تو آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا کیفیت تھی۔ ہماری نئی نسل کو تو پتہ نہیں ہے کہ اس کے ساتھ ہماری کیا چیزیں وابستہ تھیں۔ جو احباب اس زمانے میں' وہاں ہندوستان میں یا ہندوستان سے ادھر آئے ہوئے تھے' یا وہاں موجود تھے' انہیں تو یہ بھول ہی نہیں سکتا۔ اور مجھے تو کسی اعتبار سے بھی یہ نہیں بھول سکتا۔ میں تو اس کے اندر تھا' جنگ میں بھی شریک تھا' جو قتل و غارت گری ہوئی ہے' اس میں بھی محفوظ تھا' جو کچھ ہم پہ پھر بعد میں آ کر بیتی ہے کراچی میں بھی' یا پاکستان میں' میں اس میں بھی تھا۔ اس لیے میرے دل اور جگر کے یہ زخم تو مندمل ہو ہی نہیں سکتے۔ آپ کہیں گے کہ عید کی خوشیوں میں یہ کیا داستانِ غم چھیڑ دی؟ لیکن تاریخ کے جو واقعات ہیں' انہیں دہراتے رہنا چاہیے' ان کی بھی ایک اہمیت ہوتی ہے۔ آزادی کے متعلق جب یہ طے پا گیا تھا کہ چودہ اگست کو اس کا اعلان ہو جائے گا تو جو اقلیت کے خطوں یا صوبوں کے مسلمان تھے' انہوں نے وہاں سے قافلہ در قافلہ پاکستان کی طرف آنا شروع کر دیا۔ اور پھر ہندو کی ذہنیت' وہ ذہنیت جس کے اعتبار سے وہ اپنی ہزار سالہ غلامی کا انتقام مسلمانوں سے لینا چاہتا تھا' اور اس کو اس کا پہلا موقع نصیب ہوا' وہ سارا راستہ جس میں سے یہ قافلے آ رہے تھے' ہندوؤں اور سکھوں کا راستہ تھا اور انہوں نے اپنی طرف سے کسی ایک کو بھی قتل کیے بغیر' لوٹے بغیر' تباہ کیے بغیر' چھوڑا نہیں تھا۔ جو کہیں بچ کر آ گیا' یوں ہی چھپتے چھپاتے بچ کر آ گیا۔ سیکریٹریٹ کی ہماری دلی سے شام کی جو ٹرینز (گاڑیاں) آئی ہیں' معاہدے میں یہ تھا کہ ان کی حفاظت کا ذمہ ان کی TERRITORY کے اندر ان کے اوپر ہے' اور وہ انہی کی TERRITORY کے اندر ایک ایک فرد قتل کیا گیا ہے۔ ہمارے ریکارڈ کی ساری گاڑیاں جلا دی گئیں' ہمارا سامان راستے میں ان گاڑیوں میں لوٹ لیا گیا۔ پتہ نہیں آپ کا یہ فردِ گناہ گار [1] اس نوحہ خوانی کے لیے کس طرح زندہ بچ گیا' بہرحال آ گیا۔ تو یہ واقعات تھے شروع اگست سے' ان کی اطلاعات آنی شروع ہو گئی تھیں۔ یہی کچھ کم نہ تھیں کہ آخر میں ایک بم کا دھماکا ہوا۔ پاکستان کی مملکت تو وجود میں آ گئی لیکن عجیب اتفاق ہے یہ تاریخ میں شاید پہلا ہی اس قسم کا واقع ہو کہ مملکت بن گئی اور مملکت کی حدود ابھی تک متعین نہیں ہوئی تھیں۔ TERRITORY (حدود) کے متعین کیے بغیر کسی اسٹیٹ کے وجود میں آ جانے کا شاید تاریخ میں یہ پہلا واقع ہے۔ یہ ہوا تھا۔ باؤنڈری کمیشن جسے ریڈکلف کمیشن کہتے ہیں' بیٹھا ہوا تھا' وہ فیصلوں پہ تو پہنچ چکا تھا' دانستہ اس نے اپنے فیصلوں کو مخفی رکھا' اعلان نہیں کیا۔ چودہ پندرہ کو میں نے عرض کیا ہے کہ دو الگ الگ مملکتیں وجود میں آ گئیں' چودہ کو آزادی کا اعلان ہو گیا' یہاں پندرہ کو ہندوستان کا ہوا' یہ چیزیں طے ہو گئیں تو سولہ کو انہوں نے اس کا اعلان کیا۔ کیا صورت تھی اس کی؟

---

[1] یہ اشارہ جی۔ اے۔ پرویزؒ کا اپنی ہی طرف ہے۔

تقسیمِ ہند کے سلسلہ میں نقشوں کی تیاری کی کچھ روئداد

اب میں پھر معذرت چاہتا ہوں کہ درمیان میں' میں آ جاتا ہوں لیکن تاریخ کے ایک فرد کی حیثیت سے ہی یہ میں آپ کے سامنے آؤں گا' ورنہ میں اپنے آپ کو سامنے نہیں لایا کرتا۔ مسلم لیگ کے اہم کاروبار' میرے ہی مکان پہ طے پاتے تھے۔ اسی میں یہ چیز بھی شامل تھی کہ وہ حصہ جو مغربی پاکستان میں آنے والا تھا' اس کے نقشے ہم نے مرتب کیے تھے کہ کس کس علاقے میں بلکہ تحصیل وار' قائداعظمؒ محمد علی جناح (1876-1948ء) کے ارشاد کے مطابق' نقشے مرتب کیے۔ خواجہ عبدالرحیم [1] مرحوم (1908-1974ء) انہوں نے یہاں ساتھ دیا اور میرے ہاں وہ آخری نقشے مرتب ہوئے۔

ایک ایک تحصیل کے متعلق اس میں نشان دہی کی گئی تھی کہ وہاں کتنی آبادی میں مسلمان کتنی MAJORITY (اکثریت) کے اندر ہیں۔ اور آج تک وہ نقشہ میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ قائداعظمؒ (1876-1948ء) کے سامنے وہ پیش کیے تو انہوں نے سبز پنسل سے ایک نقشے پہ لکیر کھینچی تھی اور کہا تھا کہ یہ ہے ہمارا پاکستان۔ اس سے پہلے کیا ہوا؟ پھر ذرا سا ذاتی واقع ہے۔ میں نئی دلی میں تھا اور وہاں میرے ساتھ اتفاق سے میری والدہ مرحومہ' میری ہمشیرہ' خاندان کے اور افراد بھی وہاں تھے۔ دلی میں قتل و غارت گری شروع ہو چکی تھی۔ وہاں سے ہم لوگوں نے کسی نے آٹھ کو کسی نے دس کو کسی نے بارہ کو چودہ اگست 1947ء سے پہلے منتقل ہونا تھا۔ کراچی میں ACCOMMODATION (رہائش) کے متعلق کوئی گارنٹی نہیں تھی۔ دلی میں سوال ہی نہیں تھا کہ ہم ان کو رکھ سکتے ہمیں یقیناً وہاں سے چلنا تھا' کراچی آنا تھا۔ سوال یہ تھا کہ یہ جو افرادِ خاندان ہیں' ان کے متعلق میں کیا کروں۔ اس نقشے کے مطابق اور جو معلومات تھیں' ان کے مطابق' میں (موجودہ مشرقی پنجاب کے ضلع) گورداس پور کی تحصیل ''بٹالہ'' [2] کا رہنے والا تھا اور اس میں ''اتفاق'' ایک گاؤں تھا۔ آج ڈیرہ بابا نانک کا نام آپ نے سنا ہوگا۔ یہ سکھوں کا علاقہ تھا لیکن MAJORITY (اکثریت) بھی ہماری تھی اور ''بٹالہ'' کی تحصیل میں تو بہت زیادہ MAJORITY (اکثریت) تھی۔ پورا ضلع گورداس پور' ہمارے پاکستان کے علاقے کے اندر آیا ہوا تھا۔ یہ چیز اس نقشے میں تھی۔ قائداعظمؒ محمد علی جناح کس قدر مطمئن تھے اور ان کو کتنا یقین تھا اس کے لیے سنیے! میں نے جو یہ کہا ہے کہ مجھے اپنے ہی افرادِ خاندان کے متعلق طے کرنا تھا' کیا کیا جائے؟ مجھے بھی معلومات تو تھیں

---

[1] خواجہ عبدالرحیم (1908-1974ء) قانون دان' کارکن تحریک پاکستان (گولڈ میڈل 89ء)' چودھری رحمت علی کے ساتھی' بقول ڈاکٹر محمد جہانگیر خان لفظ ''پاکستان'' ان کی تخلیق ہے (سیارہ ڈائجسٹ مارچ 78ء)' سابق چیف سیکرٹری پنجاب' ماہر اقبالیات و سابق صدر مرکزی مجلس اقبال (74-1964ء) (ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ: وفیاتِ نامورانِ پاکستان' اردو سائنس بورڈ' لاہور' 2006ء' ص 486)۔

[2] بٹالہ مختلف خصوصیات کی بنا پر ایک مشہور بستی تھی' ایک مستشد قسم کا مذہبی قصبہ۔ آبادی کی اکثریت تو حنفی المسلک سنیوں پر مشتمل تھی لیکن اہل حدیث اور اہلِ تشیع بھی خاصی مؤثر حیثیت رکھتے تھے۔ اس زمانے میں قادیان جانے کے لیے بٹالہ ہی ریلوے اسٹیشن تھا۔

لیکن اور زیادہ توثیق کے لیے میں نے مناسب سمجھا کہ قائداعظمؒ (محمد علی جناح) سے مشورہ کرلوں کہ کیا کرنا چاہیے۔ یہ شروع اگست کی بات ہے' میں نے ان سے یہ پوچھا۔ انہوںؒ نے مسکرا کر کہا کہ وہ نقشہ تمہارا ہی تو مرتب کیا ہوا ہے' میں نے کہا جی! وہ ٹھیک ہے لیکن ابھی جو باؤنڈری کمیشن ہے' وہ بیٹھا ہوا ہے۔ ان علاقوں کی نو تحصیلیں تھیں' جن میں مسلمانوں کی خاصی اکثریت تھی اور گورداس پور کے تو ضلع میں ایک تحصیل پٹھان کوٹ کو چھوڑ کر' وہاں مسلمانوں کی آبادی کی کثرت تھی تو انہوں نے کہا کہ تم نے کہا نہیں تھا کہ تم وہاں ''بٹالہ'' کے رہنے والے ہو۔ یوں ہی مسکرا کر کہا کہ کہا تھا نا تم نے کہ یہ قادیان کے قریب ہے۔ میں نے کہا: جی ہاں۔ کہنے لگے کہ چوہدری ظفر اللہ (1893-1985) تو آپ کو معلوم ہے کہ باؤنڈری کمیشن پہ ہیں' تو قادیان پہ تو وہ جان دے دیں گے' اس کو تو جانے نہیں دیں گے اور پھر وہ جو ضلع گورداس پور ہے' اس میں تو مسلمانوں کی اتنی اکثریت ہے تو تم تو وہاں کے رہنے والے ہو' تو تمہیں تردد کس بات کا ہے۔ میں نے کہا کہ آپ سے میں نے توثیق چاہی ہے کہ شاید کوئی اور DEVELOPMENT ہوئی ہو؟ کہنے لگے کچھ اور ہو یا نہ ہو' ضلع گورداس پور کے متعلق تو کچھ تردد ہی نہ کرو' بھیجو گھر بچوں کو۔ میں نے شروع اگست میں' وہاں سے انہیں بٹالہ کی تحصیل میں' ڈیرہ بابا نانک کے قریب ہمارا گاؤں تھا' اس اطمینان کے ساتھ وہاں بھیج دیا کہ سب سے زیادہ محفوظ یہ ہمارا علاقہ ہے۔

تقسیم کے وقت راتوں رات باؤنڈری کمشن نے گورداس پور کی نو کی نو تحصیلیں پاکستان کے نقشے سے خارج کر دیں

جب آزادی کا اعلان ہوا تھا تو ان تحصیلوں کے جو یہ مسلمان تھے' جن کو یہ یقین تھا' انہوں نے دھوم دھام سے یہ جشن منایا تھا۔ اور وہاں کی ہندو اور سکھ آبادی' میں سمجھتا ہوں کہ' وہ دیکھ رہی تھی کہ یہ دو ہی دن کی بات ہے۔ سولہ اگست (1947) کی شام کو ANNOUNCEMENT (اعلان) ہوئی کہ وہ جو نو کی نو تحصیلیں تھیں' وہ انہوں نے ہندوؤں کے علاقے میں دے دیں۔ جن علاقوں میں پہلے پتہ تھا کہ ہم تو اقلیت میں ہیں' ہم نہیں رہ سکتے' ان کو تو پھر بھی یہ تھا کہ کچھ نہ کچھ انہوں نے سوچ تو رکھا تھا کہ ہم نے کیا کرنا ہے۔ یہ جو علاقے تھے' جن کے متعلق یقین تھا کہ یہ پاکستان کے اندر ہیں' سوچنے کی بات نہیں تھی۔ میں نے عرض کیا ہے کہ پتہ نہیں کہ میں اور میرے جیسے اور کتنے ہوں گے' ہم نے اپنے بچوں کو وہاں بھیج دیا۔ سولہ کی شام کو یہ اناؤنسمنٹ ہوا' سترہ کا دن اس میں گزرا کہ وہاں سے کوئی خبر تو آئے۔ خبر کے ذرائع انہوں نے پہلے منقطع کر دیئے ہوئے تھے۔ اٹھارہ کی صبح کو وہاں پہلی عید تھی۔ گاڑیاں جو ادھر سے جا رہی تھیں' خون سے لتھڑی تھیں' زندہ انسانوں کی بجائے وہاں سے انسانوں کے جسموں کے ٹکڑے اندر سے نکلتے تھے۔ یہ جو اکثریت کے ہمارے علاقے تھے' یہ نو تحصیلیں اور کم از کم ایک پورا ضلع' ایک دن کے اعلان سے' وہ سارے کے سارے ایسے

بنا دیئے گئے جیسے بھیڑیوں کے چنگل میں انسانوں کو گھیر کر بھیج دیا ہوا ہو۔ اس حالت میں وہ پہلی عید ہم پہ آئی۔ ہندوستان میں تھے تو میں تو ایک جنونی تھا' کیا کہتے ہو! ہر عید کے بعد عام طور پہ احباب آیا کرتے تھے' چشمِ پرنم سے گنگنایا کرتا تھا' سنایا کرتا تھا کہ بھئی!

عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں
عیدِ محکوماں ہجومِ مومنین

عید تو میں نے کہا آزاد لوگوں کی عید ہوتی ہے' محکوموں کی عید کیا صاحب! ایک ہجوم ہے اکٹھا ہو گیا۔ وہاں جو آئے تو ذہن میں ہو گیا کہ اب جو عیدِ آزاداں ہے' اس کی پہلی عید ہمیں میسر ہو گی' وہ ساری خوشیاں ہمارے ذہن میں تھیں اور ہمیں پہلی عید جو آئی اپنی آزاد مملکت میں تو وہ اس کیفیت سے عید آئی تھی۔ عجیب کیفیت ہے' میں اس کیف اور سرور کو نہیں بھول سکتا جو وہاں عید کی دو رکعتوں میں مجھے سعادت نصیب ہوئی۔ قائداعظمؒ (محمد علی جناح) اگلی صف میں تھے' ان کے بعینہٖ ٹھیک پچھلی صف میں' بالکل ان کے پیچھے' میں کھڑا تھا۔ ایک عظیم شخصیت جس نے ہندو جیسی قوم کی غلامی کی زنجیروں سے چھڑا کر ہمیں آزادی دی تھی۔ وہ مردِ مومن جنہیں میں دس سال سے قریب سے جانتا تھا' دل بھی مومن' دماغ بھی مومن بڑی بلند شخصیت' اور ان کے پیچھے یہ سعادت کہ دو رکعتیں نماز کی ادا کی گئیں۔ اقبالؒ (1877-1938ء) نے ''جاوید نامہ'' میں کہا ہے' عجیب چیز ہے۔ وہاں تو دو رکعتیں وہ جلال الدین افغانی اور سید حلیم پاشا کے ذکر میں آیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است

اس قسم کے انسانوں کے ساتھ اگر کہیں دو رکعت نماز کی مل جائے' اطاعت اس کو کہتے ہیں۔

ورنہ آں کارے کہ مزدش جنت است

''ورنہ او دیہاڑی ہوندی ہیگی اے' جیہدی جنت ملدی ہوندی ہیگی [1] آ''۔ کیا بات ہے اقبالؒ کی!

با چنیں مرداں دو رکعت طاعت است
ورنہ آں کارے کہ مزدش جنت است

میں نے کہا ہے کہ اس کے لیے دیہاڑی کا ہی لفظ صحیح آتا ہے' ورنہ یہ وہ کام ہے جس کی مزدوری جنت مل جاتی ہے۔ اطاعت تو اس قسم کے مردوں کے ساتھ دو رکعتیں ادا کرنا ہیں۔ عزیزانِ من! وہ دو رکعتیں جو میں نے اپنی زندگی میں ادا کی ہیں' اس مردِ مومن کے پیچھے کھڑے ہو کر' میں ساری عمر ان کا کیف و سرور نہیں بھول سکتا۔ لیکن اس عید کے بعد جب وہ کھڑے ہوئے اور ہجوم کر کے لوگ

---

[1] ورنہ وہ ''دیہاڑی'' ہوتی ہے' جس کے عوض جنت ملا کرتی ہے۔

ملنے کے لیے جا رہے تھے‘ ان کی آنکھوں کا جو نم تھا وہ مجھ سے ہزار داستانیں کہہ رہا تھا۔ عید کی خوشی میں مل رہے تھے لوگوں سے‘ جگر میں ٹیس لب ہنسنے پہ مجبور‘ یہ تھی وہاں کی زندگی ان کی۔ عزیزانِ من! ان کی پہلی عید اس طرح سے آئی تھی ہمارے پاس۔ اور پتہ نہیں میں تو یوں ہی عرفِ عامہ میں کہتے ہیں کہ یہ نحس ہوتی ہے یا خوش ہوتی ہے میں یہ تو نہیں جانتا لیکن وہ پہلی عید جس طرح سے غم آلود گزری‘ 33 سال ہو گئے‘ 33 عیدیں آئیں‘ ایک عید بھی تو خوشی کی نصیب نہیں ہوئی ہے۔ پتہ نہیں کہ یہ طرح ایسی پڑ گئی اس پہلی عید کی ہمارے ہاں‘ میں کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا ہوا۔ ’’عیدِ آزاداں شکوہِ ملک و دیں‘‘ وہ ایک شاعر کا مصرع یہ ہے‘ وہ اس لیے کہ اس نے سچ کہا تھا اس نے عیدِ آزاداں کہا تھا۔ آزادی محض مملکت کے نقشے کے اوپر لکیر کھینچنے سے تو حاصل نہیں ہو جاتی۔ آزادی اور چیز ہوتی ہے۔ ملک کا آزاد ہو جانا اور چیز ہوتا ہے‘ انسانوں کا آزاد ہونا اور چیز ہوتا ہے۔ وہ نہیں نصیب ہو سکی۔ اس کے باوجود آپ جانتے ہیں کہ میں تو ان میں سے ہوں جو کہا کرتا ہوں کہ

مِلّت کے ساتھ رابطۂ اُستوار رکھ
پیوستہ رہ شجر سے‘ اُمیدِ بہار رکھ!

(اقبال: بانگِ درا)

کسی ملک کی آزادی اور انسانوں کی آزادی میں بنیادی فرق

ہجومِ مومنین سہی‘ بہرحال امت کے افراد تو ہیں‘ جیسے ہم ہیں باقی بھی اسی قسم کے ہیں‘ ہمیں کون سے لعل لگے ہوئے ہیں‘ اس لیے امت کے ساتھ ایک قومی شعار کی حیثیت سے ہی سہی‘ ہماری عیدیں ہماری نمازیں اور کچھ نہیں۔ لیکن 33 سال میں ایک عید بھی عیدِ آزاداں جسے کہا جاتا ہے‘ وہ نصیب نہ ہوئی۔

آزادی کے بعد سے اس وقت نامساعد حالات کے پیشِ نظر نوجوان نسل کی پریشان نظری اور اس کا حل

میرے لیے تو اور بھی دکھ کی بات ہو جاتی ہے۔ یہاں جب بھی کوئی بات ناسازگاری‘ نامساعدی گزرتی ہے تو ہمارا نئی نسل کا جو نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ہے‘ وہ آتا ہے اور وہ کہتا ہے کہ بالآخر ہم نے پاکستان بنا تو دیا‘ ہمیں حاصل کیا ہوا؟ روز روز کا خطرہ‘ خود ہندوستان ہی کا خطرہ‘ آپ دیکھیے تو سہی ہمارے سر کے اوپر ایک Sword (تلوار) لٹکی ہوئی ہے۔ وہاں رہنے سے یہ خطرہ تو نہ ہوتا‘ وہاں رہتے تو کم از کم ہماری حفاظت مشترکہ ہوتی‘ ہندو خود حفاظت کرتا۔ یعنی یہ چیزیں دلوں میں ابھرتی ہیں کہ پاکستان بنا کر ہم نے کیا حاصل کیا؟ اور جو بے باک ہیں‘ وہ پھر اس کے بعد کہتے ہیں کہ وہ جو قائداعظمؒ تھا‘ وہ یہ سب کچھ کر کے آپ تو چلا گیا‘

ہمیں اس مصیبت میں پھنسا گیا۔

ہم نے آج تک تحریکِ پاکستان کی کوئی مستند تاریخ ہی رقم نہیں کی

میں اس نوجوان طبقے کو معذور سمجھتا ہوں۔ ہندو کے ساتھ ان کو واسطہ نہیں پڑا' ہم نے انہیں بتایا نہیں کہ ہندو کیا ہے' ہم نے اپنی تاریخ ہی مرتب نہیں کی' انہیں پتہ ہی نہیں ہے کہ ہندو کیا ہے۔ چاہیے تو یہ تھا کہ بلند سطح کے اوپر' حکومت کی طرف سے' اس 33 سال میں تحریکِ پاکستان کی ایک مستند تاریخ لکھی جاتی: ہندوستان میں مسلمان کی کیفیت کی' اس آزادی کی اہمیت کی' قائداعظمؒ کے احسانات کی ایک تاریخ مستند۔ ہم نے یہ کچھ نہیں کیا' نوجوان کو کچھ پتہ ہی نہیں تھا۔ عزیزانِ من! جو چیزیں اس بڑے پیمانے پہ ہونی چاہئیں' میں اپنے چھوٹے سے پیمانے پر یہ چیزیں کرتا رہتا ہوں۔ جب بھی کچھ ایسا ہوا' میں نے اپنے نوجوان طبقے کو بتایا کہ ہندو کیا ہے اور کیا کرنا چاہتا ہے۔ مضمون لکھے' پمفلٹ بھی شائع کیے۔

''ہندو کیا ہے''؟ کے پمفلٹ کی اشاعت کا تقاضا ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جائے

اس وقت جو خطرات منڈلا رہے ہیں' میں نے پھر محسوس کیا ہے' اپنے اسی فریضے کی ادائیگی کے طور پر۔ اب پھر میں نے یہ پمفلٹ ادارہ طلوعِ اسلام کی طرف سے شائع کیا ہے۔ ''ہندو کیا ہے اور اس کے عزائم کیا ہیں اور وہ کیا کرنا چاہتا ہے؟'' اس دفعہ اس کو میں نے کچھ زیادہ بھرپور کر دیا ہے۔ آپ اسے زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کیجیے۔ کم از کم یہ تو معلوم ہو کہ یہاں ہزار تکلیفیں سہی' ہزار مشکلات سہی' ہزار نامساعد حالات سہی' بہرحال ہندو کی غلامی سے یہ چیز تو نہیں ہے۔ یہ وہ شخص کہہ رہا ہے جس نے اپنی زندگی کا آدھا حصہ ہندوؤں کے ساتھ گزارا' ہندوؤں کے اندر گزارا' ملازمت میں ان کے ساتھ رہ کر گزارا' وہاں سے تقسیم کی تمام جتنی بھی یہ خون کی ندیاں تھیں ان کو تیر کر گزارا' پاکستان کو دیکھا' تاریخ کے اوپر نگاہ رکھی کہ یہ کیا کچھ ہمارے ساتھ کر رہا ہے۔ یہ پمفلٹ' بہرحال بڑا اچھا ہوا' یہ چھپ گیا ہے' میں چاہتا تھا کہ یہ پندرہ تاریخ تک شائع ہو جائے۔ یہ اس سال کی یومِ آزادی پر یہی چیز ہے جو ادارے کی طرف سے آپ حضرات کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

انسان حیوانوں کا مالک تو ہو سکتا ہے مگر انسانوں کا نہیں

اور عجیب بات ہے کہ درسِ قرآنِ کریم کا سلسلہ' جو ہم 11 جولائی کو جہاں تک ہم پہنچے تھے' اب جو میں نے آج ہی صبح دیکھا کہ کہاں تک ہم پہنچے تھے' تو عجیب چیز وہاں سامنے آئی۔ آپ کو یاد ہے کہ اس میں' میں نے یہ کہا تھا کہ قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ کوئی انسان تو کسی دوسرے انسان کا مالک ہو نہیں سکتا البتہ حیوان وہ ہیں جن کا مالک انسان ہو جاتا ہے۔ تو جن انسانوں کا مالک کوئی

دوسرا انسان ہوجائے' وہ کہتا ہے کہ وہ انسانیت کی سطح پہ نہیں ہوتے' حیوانیت کی سطح پر ہوتے ہیں۔ مالک کے معنی ہیں ''صاحبِ اقتدار ''۔ان کی اتھارٹی جن کے اوپر ہوجائے تو انہوں نے کہا ہے کہ پھر ان کی سطح حیوانوں کی ہوتی ہے' ان کی زندگی حیوانوں کی ہوتی ہے' قرآن کریم نے لھا مالکون (36:71) کہا ہے۔ میں نے کہا تھا کہ قرآنِ کریم میں یہاں مالکون آیا ہے اور جہنم کے داروغے کا نام قرآن نے مالک قرار دیا ہے۔ جہاں دروازے پہ مالک کھڑا ہو' اس کے اندر والے تو سارے جہنم میں ہوتے ہیں۔ عزیزانِ من! غلامی یہ ہے کہ کوئی انسان دوسرے انسان کا محکوم ہو۔ اسلامی مملکت میں یہ سوال ہی نہ ہو کہ وہ کون انسان ہے اور کس کا محکوم ہے۔ وہاں تو وہ خدا کا محکوم ہے۔ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم ہو تو قرآن کی رو سے وہ محکومی ہے۔ آزادی یہ ہے کہ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَ الْحُكْمَ وَ النُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ لٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں' خواہ اس کو قانون سازی کے اختیارات ہیں' خواہ EXECUTIVE انتظامیہ کے اختیارات ہیں' وہ نبی بھی کیوں نہ ہو' اس کو بھی اس کا حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان سے کہے کہ تم میرے محکوم بن جاؤ' یہ اسے کہنا چاہیے کہ آؤ! ہم سب مل کر خدا کے محکوم بنیں۔

خدا کا محکوم ہونا کوئی نظری بات نہیں' یہ تو اس کے احکامات کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کا نام ہے

محکومیت کی یہ بات قرآن نے ABSTRACT (غیر محسوس) یا نظری طور پہ نہیں چھوڑی' کہ ہم یہ کہہ دیں کہ ہاں صاحب! اِيَّاكَ نَعْبُدُ (1:4) ہم نے قرآن میں دہرا دیا ہے ''ہم تیرے ہی محکوم ہیں'' اور اس کے بعد سمجھ لیا کہ ہم تیرے ہی محکوم ہیں۔ قطعاً نہیں! یہ عملی چیز ہے۔ کہا کہ خدا کی محکومی تو وَ بِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (3:79) ہے۔ اس کی کتاب کی عملی تعمیل کا نام خدا کی محکومی ہے۔ اور یہی اسلام اور کفر میں خطِ امتیاز ہے۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ (5:44) کفر اور اسلام کے اندر فرق بڑا نکھرا ہوا ہے: ''جو بھی خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کرتے ہیں انہیں کافر کہا جاتا ہے''۔ اور یہ جو ہیں یعنی جو خدا کی کتاب کے مطابق فیصلے نہیں کریں گے بہرحال انسانوں کے مطابق کریں گے۔ اس کی شکل کچھ بھی کیوں نہ آپ کر لیں' انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کے تابع جب چلیں گے تو آزادی نہیں ہوگی' وہ محکومی ہوگی' اسلام نہیں ہوگا کفر ہوگا۔ اور انہی کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ جب دوسرے انسان پھر مالک بنتے ہیں تو انسانوں پہ حیوانات کی شکل اختیار ہو جاتی ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ و ذللنٰھا (36:72) ان کو ذلیل کیا جاتا ہے۔

محکومی کا پہلا نشان یہ ہے کہ وہاں تکریمِ آدمیت نہیں ہوتی

محکومی اور جہنمی زندگی کی پہلی لعنت یہ ہے کہ انسان کو ذلیل کیا جائے گا جبکہ وَ لَقَدۡ کَرَّمۡنَا بَنِیۡۤ اٰدَمَ (17:70) تمام انسانوں کو محض انسان ہونے کی جہت سے ہم نے واجب التکریم پیدا کیا ہے۔ جوں ہی کسی انسان کی کہیں ذلت ہو اور ان کی تکریم میں فرق آ جائے، سمجھ لیجیے کہ وہ انسانیت کی سطح پہ نہیں، وہ اسلام نہیں وہ کفر ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ لَهَا مٰلِكُوۡنَ . وَذَلَّلۡنٰهَا (36:71-72) پھر کیا کرتے ہیں وہ جو حاکم ہوتے ہیں محکوموں کے ساتھ؟ کہا کہ فَمِنۡهَا رَكُوۡبُهُمۡ (36:72) ان پہ سواری کرتے ہیں۔ یعنی حیوان اور یہ انسان جو انسانوں کے محکوم ہوتے ہیں، ایک درجے پہ لا کر وہ کہتا ہے کہ پھر ان پہ سواری کرتے ہیں مِنۡهَا يَاۡكُلُوۡنَ (36:72) کھا جاتے ہیں۔ وَلَهُمۡ فِيۡهَا مَنَافِعُ وَمَشَارِبُ (36:73) خون تک پی جاتے ہیں، طرح طرح کے ان سے فائدے اٹھاتے ہیں، طرح طرح کی خدمتیں لیتے ہیں۔ حیوان و محکوم انسان کی یہ کیفیت ہوتی ہے۔ اور وہ جو میں نے کہا کہ صبح ہی آج میرے ذہن میں یہ آیا۔ کہا کہ اَفَلَا يَشۡكُرُوۡنَ (36:73) یہ انسان جنہیں ہم نے انسانوں کی محکومی سے چھڑایا ہے، ان سے پوچھو کیا اس کا یہ شکریہ ادا نہیں کرتے۔ آج ہی یہ بات ہوئی کہ یہ تو ہمارے متعلق کہا گیا ہے، ہم اس کا شکریہ ہی ادا نہیں کرتے۔ ہم کہتے یہ ہیں کہ یہ کیوں کر دیا قائداعظمؒ نے؟ کاہے کے لیے بنا لیا ہم نے پاکستان؟ یعنی جذبۂ تشکر نہیں ہے۔

مذہبی طور پر ہندو قوم کی نفسیاتی کیفیت کا ایک عملی مظاہرہ

عزیزانِ من! تکالیف کا ہونا اور بات ہے، نامساعداتِ حالات کا ہونا اور بات ہے لیکن یہ جو چیز ہے کہ اس کا تو جذبۂ تشکر ہونا چاہیے تھا کہ تم یعنی وہ آپ اس کے اندر دیکھیں گے کہ اس کی ذہنیت ہندو کی کمینگی تھی، تنگ نظری تھی، تنگ ظرفی تھی وہ SADISTIC ذہنیت اس کی PSYCHOLOGICALLY دوسروں کو اذیت دے کے وہ خوش ہوتا تھا۔ کالی دیوی اس کا معبود تھا، اس کا خدا تھا، چار ہاتھ، چاروں کے اندر تلواریں، سرخ رنگ کی زبان اتنی باہر نکلی ہوئی، اس قدر ڈراؤنی آنکھیں اس کی، یہ ان کے مندر کے باہر ہوتا تھا اور ہم روز اس کو دیکھتے تھے۔ جان لاک (1632-1704) نے یہ کہا تھا کہ تم مجھے یہ بتا دو کہ فلاں قوم نے اپنی پرستش کے لیے کس قسم کا خدا تجویز کر رکھا ہے، میں اس قوم کی پوری کیفیت، ذہنیت، فلسفہ، تہذیب، سب کچھ تمہیں بتا دوں گا۔ یہ تھی وہ قوم۔ غیر ہندو تو ان کی نگاہوں کے اندر انسان ہی نہیں ہوتے تھے۔ خود اپنے ہاں جن کو وہ ہندو کہتے تھے، ان میں بھی انہوں نے ورنوں کے ذریعے، برہمن پیدائش کی رو سے برہمن ہے یعنی یہ کسی QUALIFICATION (لیاقت) یا میرٹ کی رو سے نہیں ہے، وہ ایک طبقہ ہے جو پوری کی پوری حکومت کا حق رکھتا ہے۔ اس کے بعد دوسرے درجے کے اوپر انہوں نے کھشتری کو

بنایا کہ وہ گائے کے سینگ پکڑے گا دودھ برہمن دوھے گا۔

برہمنوں کی سڑک پر سے شودروں کا گزر ہی نہیں ہوسکتا بلکہ اسے توقتل کر دیا جاتا ہے

اب باقی رہا اس گائے کا چارہ' اس کا گوبر وغیرہ' یہ کچھ کرنے کے لیے انہوں نے کچھ ویش بنائے کہ وہ چارے وارے کا انتظام کریں' وہ شودر بنا دیئے کہ یہ اس کی خدمت گزاری کریں۔ خود اپنے ہاں کے یہ جو ہندو تھے' ان کو تقسیم جو کیا' آج بھی جہاں انڈیا کے اندر یہ شودر زیادہ ہیں' وہ اس سڑک پہ نہیں چل سکتے جس سڑک کے اوپر برہمن چلتا ہے۔ جہاں بھی وہ چلتے ہیں ان کو ایک گھنٹی اپنے پاس رکھنی پڑتی ہے جو وہ کھٹ کھٹ کرتے جائیں کہ وہ برہمن دور سے سن کر الگ ہو جائیں کیوں کہ اگر کسی برہمن پہ شودر کا سایہ پڑ جائے برہمن کو تو بنارس جانا پڑتا ہے اور شودر کو قتل کر دیا جاتا ہے۔ آج بھی ان کے کسی کنویں سے اگر کوئی شودر پانی بھر لیتا ہے' تو آپ نے اخباروں میں آئے دن دیکھا ہوگا ان کے گاؤں کی پوری کی پوری GATHERING (آبادی) ہی جلا دیتے ہیں۔ ان کے بچوں کو لا کر اپنے ہاں کے مندروں میں دیوتاؤں کے سامنے ان کی قربانی دیتے ہیں۔ یہ اپنے ہاں کے ہندوؤں کا ہی ایک ورن ہے۔ آپ سوچ لیجیے۔ میں نے یہ دیکھا کہ قرآنِ کریم نے جو کہا ہے کہ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ (36:73) تو کتنا بڑا یہ سانحہ قابلِ تشکر ہے' قابلِ شکر گزاری ہے۔ کم از کم اس قسم کے مالک جسے قرآن نے کہا ہے' اس قسم کے حاکم اور حکومت کا انہوں نے ایسا انداز رکھا تھا کہ کوئی بظاہر پہچان نہ سکے کہ کیا کر رہے ہیں۔ جمہوریت ہوگی' جی! یہاں ڈیما کریسی ہوگی' ان ہندوؤں نے یہ کہا تھا۔

اکثریت کی بنا پر ہندوستان میں مستقل طور پر ہندوؤں کی حکومت کا نام جمہوریت ہے

ڈیموکریسی کیا ہوگی؟ یہ اکثریت کی حکومت۔ مذہب کے اعتبار سے وہاں ہندو کی اکثریت INCONVERTIBLE (نا قابل تبدل) ہے یعنی وہ کبھی بھی اقلیت میں نہیں جا سکتے' مسلمان وہاں کبھی اکثریت میں نہیں آ سکتا اور اس کا نام ہے' جمہوریت۔ یہ مستقلاً مسلمانوں کے اوپر ان کی حکومت ہے۔ ساری دنیا میں یہ چیز تھی کہ یہ ڈیموکریسی ہے' جمہوریت ہے' کسی کو گلہ ہی نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ تھا وہاں کا انداز۔ اب وہاں کرنکال سے ایک خطۂ زمین تو ایسا مل گیا بہرحال' کہا ہے کہ اَفَلَا یَشْکُرُوْنَ (36:73) یہ شکر کیا تھا؟ کیا خدا اس کا محتاج ہوتا ہے کہ ہم اسے کہیں کہ THANK YOU شکریہ' A KIND OF YOU یہ بات تو ہے نہیں کہ شکر کے یہ معنی ہیں۔ شکر کے معنی اس نے اگلی آیت میں کہے۔ کہنے لگا کہ ناشکر گزاری یہ ہے کہ وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اٰلِھَۃً (36:74) ان کو چاہیے یہ تھا کہ صاحبِ اقتدار صرف اس کو مانتے۔ انہوں نے اسے چھوڑ کر انسانوں کو صاحبِ اقتدار مان لیا۔ یہ ان کی شکر گزاری ہے۔ کیا بات ہے صاحب! خود بتایا کہ جو ہم نے کہا ہے کہ یہ شکر گزار نہیں' اگلی آیت میں بتایا کہ شکر

گزاری کا مفہوم کیا تھا؟

مفاد پرستی کی ذہنیت اور انسان کے لاؤلشکر مکافاتِ عمل کی زنجیروں میں جکڑ لیے جاتے ہیں

عزیزانِ من! یہ ہم آ گئے سورۃ یٰس کی آیت 74 پہ' جہاں سے آج کا درس شروع ہوتا ہے۔ کہا ہے کہ لَعَلَّهُمْ يُنْصَرُوْنَ (36:74) ہر ایک اپنے مفاد کی خاطر دوسروں کو خدا بنانے لگ گیا کہ یہ میرے ناصر اور میرے حامی و مددگار ہوں گے۔ یہ کچھ ہونا شروع ہو گیا حالانکہ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَهُمْ (36:75) ان کو یہ معلوم نہیں ہے کہ یہ سارے ہی مفاد پرست ہوتے ہیں' کوئی دوسرے کی مدد نہیں کرتا بغیر اپنے PURPOSE اور اپنے مقصد کے۔ جس وقت بھی ان کا وہ مقصد پورا ہو گیا' تم پوچھو نہیں کہ وہ تمہیں کس طرح دھتکار کر رکھ دیں گے۔ کہا کہ یہ بھی اور تم بھی سمجھتے ہو کہ ان کا جتھہ بڑا مضبوط ہے' یہ سارے کے سارے ان کا لاؤ لشکر بھی ہے۔ وَهُمْ لَهُمْ جُنْدٌ مُّحْضَرُوْنَ (36:75) یہ ان کے لاؤلشکر' ان کی پارٹیاں' یہ ساری جتنی بھی ہیں' ان سب کو تم دیکھو گے کہ ہمارے قانونِ مکافاتِ عمل کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے' خدا کی عدالت میں حاضر کیے جائیں گے۔ یہ صاحبِ اقتدار کس طرح سے ہو سکتے ہیں؟ کہا کہ ان کی تو یہ کیفیت ہے۔

نبی اکرم ﷺ کی حساس طبیعت کی کیفیت کے متعلق قرآن حکیم کا ارشادِ خداوندی

اب نبی اکرم ﷺ کے متعلق یہ چیز ہے کہ فَلَا يَحْزُنْكَ قَوْلُهُمْ اِنَّا نَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا يُعْلِنُوْنَ (36:76)- آپ کو یاد ہے کہ میں نے مختلف آیات کے حوالے دیئے تھے جن میں کہا تھا کہ نبی اکرم ﷺ ایک طبیب مشفق کی طرح تھے' ان کی کیفیت یہ تھی کہ مریض ضد کرتا ہے' علاج نہیں کراتا' دوائی نہیں کھاتا' پرہیز نہیں کر رہا' اپنے آپ کو جوکھوں میں ڈال رہا ہے' آہستہ آہستہ موت کی طرف چلا جا رہا ہے' یہ ﷺ اپنی انتہائی کوشش کر رہے ہیں' وہ یہ کچھ نہیں کرتا۔ قرآن نے کہا ہے کہ یہ تو اپنے ہاتھوں مرے گا' تم ان کے غم میں اپنی جان گھلا دو گے۔ او تمہارا فریضہ تو یہ تھا کہ تم صحیح تشخیص کر دیتے' علاج تجویز کر دیتے' دوائیوں کا پتہ بتا دیتے' اس کے بعد تمہارا فریضہ یہ نہیں ہے کہ تم اندر آ کر کلورو فام دوائی بھی ان کو خود دیا کرو۔ یہ ان کے اپنے بس میں ہے' زندہ رہنا چاہتے ہیں تو سارا علاج ہم نے بتا دیا ہے' وہ کریں' نہیں رہنا چاہتے مرتے ہیں' تو مریں۔ تم اپنی جان کیوں گھلاتے ہو اس قسم کے بیمار' اس قسم کے ضدی مریضوں کی خاطر' اس لیے کہا کہ لَا يَحْزُنْكَ (36:76)۔ ان کے غم میں اپنی جان نہ گھلاؤ۔ پھر یہ چیز کہ تمہارے متعلق' تمہارے اس نظام کے متعلق' تمہارے ساتھیوں کے متعلق باتیں کرتے ہیں' یہ جو اس سے بھی تم غم آلود ہو جاتے ہو۔ اس کی پرواہ نہ کیا کرو' یہ لوگ بڑے تنگ نظر ہیں' کرنے دو جو کچھ یہ باتیں کرتے ہیں' یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اِنَّا نَعْلَمُ مَا

یُسِرُّوْنَ وَمَا یُعْلِنُوْنَ (36:76) کچھ ان میں سے وہ بھی ہیں جو منافقت کے طور پر آ کر تمہارے ساتھ ہمدردی کی کچھ باتیں کرتے ہیں' ہم وہ بھی جانتے ہیں جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ سب سے بڑی چیز' جس پہ سارے صحیح معاشرے کا' انسانیت کے اخلاق کا' افراد کے کیریکٹر کا' مدار ہے' وہ صرف یہ ایک بات ہے' جسے ایمان بالآخرت کہتے ہیں۔

انسانی زندگی کی تمام ثمر باری جہانِ فردا کے متعلق مکافاتِ عمل کے ایمان پر ہے

یہ ایمان بالآخرت نظری چیز نہیں ہے۔ انسان کے کردار کا' سیرت کا سارا دار و مدار' اس چیز پر ہے کہ میرا کوئی عمل' میرا کوئی کام 'حتیٰ کہ دل میں گزرنے والا خیال اور ارادہ بھی' بغیر نتیجہ پیدا کیے نہیں رہ سکتا۔ اب ایک ہی چیز ہے کہ وہ زندگی میں دیکھتا ہے کہ نتیجہ تو پیدا ہو نہیں رہا' جو جی میں آئے یہ کرتے چلے جاتے ہیں' کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں' عیش کرتے ہیں' زندگی میں بھی عیش کرتے ہیں' مرنے کے بعد بھی بڑے شاندار مقبرے بنتے ہیں۔ تو خوامخواہ کے لیے یہ کہہ رہے ہیں کہ ہر برا عمل اپنا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔

انسانی زندگی ایک ایسی عمارت ہے جو حسنِ عمل کے سہاروں کے بغیر تعمیر ہی نہیں ہو سکتی

یہاں سے بات شروع ہوتی ہے کہ زندگی اسی سانس کی آمد و رفت کی بات نہیں ہے کہ یہ ختم ہو گیا اور تم نے کہا کہ چلو' معاملہ ختم ہو گیا' ان کا تو اس کے متعلق کوئی نتیجہ ہی نہیں برآمد ہوا۔ سنیے! زندگی ختم نہیں ہوتی زندگی آگے چلتی ہے۔ جو کچھ یہاں کا کیا ہوا ہوتا ہے' اس کو ساتھ لے کر آگے چلتی ہے۔ وہ جو قرآن کے الفاظ ہیں اور میں دہرایا کرتا ہوں کہ ''جو کچھ تم کہتے ہو ''میرا ہے'' وہ تو یہاں رہ جاتا ہے' یہ جو تمہاری ''میں'' [1] ہے' یہ آگے چلتی ہے۔ اور یہی ہے وہ جو خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق آگے چلتی ہے۔ یہ جزا اور سزا کے الفاظ تو ہم بولتے ہیں' ان کے ہر عمل اور ہر خیال کا جو بھی نتیجہ پیدا ہوتا ہے' وہ اس کی ''میں'' اس کو اپنے ساتھ لیے ہوئے' آگے چلتی ہے۔

عزیزانِ من! یہ ہے ایمان بالآخرت' آپ کے ہاں کے انفرادی کیریکٹر کا اور اجتماعی سیرت و کردار کا سارا دار و مدار اس پہ ہے۔ اس کے علاوہ انسانوں کے اندر اصلاح پیدا کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں ہے' جو جی میں آئے کر کے دیکھ لیجیے اصلاح نہیں ہو سکے گی۔ خالی قانون کی رو سے جیسے آپ حیوانوں کی سطح پر بھیڑ بکریوں کو' ڈنڈے کے زور پہ ایک طرف لے جاتے ہیں' اسی طرح انسانی دنیا میں قانون کی رو سے آپ لے جا سکتے ہیں۔ KEEP TO THE LEFT (بائیں طرف چلو) کے لیے آپ کو سپاہی کھڑا کرنا پڑتا ہے' یہ ایسے ہی ہے جیسے ایک بکری کو' دوسرے کے کھیت میں گھسنے سے روکنے کے لیے' اس کے ساتھ ایک چرواہے کی ضرورت ہوتی

---

[1] میں I am ness' Self' ذاتِ انسانی' شخصیت

ہے۔ بکری کے اندر تو اور کوئی تغیر نہیں پیدا کر سکتے' یہاں انسانی دنیا میں بھی قانون کی رو سے کوئی تغیر نہیں پیدا کر سکتے۔ وہ جو سائیکل والا ہے' وہ وہاں چوراہے پہ دور سے دیکھتا ہے کہ کہیں وہ لال پگڑی والا تو نہیں ہے (اب تو خیر وہ لال پگڑی بھی نہیں ہے) یعنی اگر اسے معلوم ہو کہ یہاں سپاہی کھڑا نہیں ہے تو اس چکر میں بائیں طرف جانے سے' کچھ دو پاؤں کا ہی سائیکل کے اوپر فرق پڑتا ہے' وہ بائیں طرف نہیں جاتا' دائیں طرف دندناتا ہوا جاتا ہے' سیٹی بھی بجاتا ہے کہ دیکھو! میں نے کتنا کارِنمایاں کیا ہے۔ سپاہی کھڑے کرنے سے اندر کی تبدیلی نہیں آتی۔ یہ جسے ایمان بالآخرت کہا کرتے ہیں' یہ الفاظ نہیں ہیں' یہ اندر تغیر ہے کہ چوراہے پہ سپاہی ہے یا نہیں ہے اس کی مجھے پرواہ نہیں ہے' میں نے اگر غلط طرف اپنا رخ کیا تو مجھے اس کا نتیجہ بھگتنا پڑے گا۔ یہ ہے ساری بات۔

اہل یورپ کے فلاسفر' عقل کی بنیاد پر' خراماں خراماں قرآنِ حکیم کے بیان کردہ تصورات کی طرف آ رہے ہیں

میں پھر ضمناً عرض کر دوں کہ اس وقت تک تو ٹھیک ہے کہ ہم اس کو از روئے ایمان مانتے چلے آ رہے تھے' تھوڑی بہت اس کے اندر ہم دلیلیں بھی دیتے تھے۔ عجیب بات ہے کہ ''پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانوں سے'' میں دیکھ رہا ہوں کہ یورپ امریکا کے جو فلاسفرز ہیں' وہ اب اس چیز پہ آ رہے ہیں کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے۔ آپ حیران ہوں گے کہ یہ ثابت کرنے کے لیے ان کی تصنیفات آ رہی ہیں کہ انسان کی زندگی آگے بھی چلتی ہے جسے IMMORTALITY کہتے ہیں' یعنی وہاں کی حیاتِ جاوید یہ بات لمبی ہو جائے گی۔ وہ سائیکولوجی کے ڈاکٹر جونز[1] (Jones:1879-1958) وغیرہ تھے' یوں تو وہ SURVIVAL تک[2] پہنچا تھا کہ مرنے کے بعد بھی زندگی ہے' وہ یہیں تک ہی تھا' کہتا تھا کہ میں آگے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اب وہ آگے گئے ہیں اور وہ اس کو SURVIVAL ہی نہیں کہتے' وہ IMMORTALITY تک گئے ہیں۔ اب وہاں یہ ہو رہا ہے۔ اگلے دنوں وہاں کا ایک فلاسفر پروفیسر لیو' یہاں آیا تھا' اس نے دو تین لیکچر بھی دیئے تھے۔ تین کتابیں تو اس کی مجھے مل گئی ہیں۔ THEME (موضوع) ہی اس کی یہ ہے۔ وہ اور اس کے ساتھ بڑے بڑے دوسرے فلاسفرز بھی شامل ہیں' جو اس سے IMMORTALITY پر انکار کرتے تھے' وہ ان کے ساتھ اس میں بحث بھی کرتا ہے۔ اس کی آخری کتاب جو آج کل ہے' وہ ہے:

THE SCIENCE AND IMMORTALITY

---

[1] یہ اشارہ اس جونز کی طرف سے جو فرائڈ سگمنڈ (1856-1939ء) کا پیروکار اور برطانوی ماہر تحلیل نفسی تھا۔ وہ برطانیہ اور شمالی امریکا میں تحلیلِ نفسی کی ترویج ونشوونما کا آلہ کار تھا۔ اس نے فرائڈ سگمنڈ کی سوانح حیات (56-1953) بھی تحریر کی تھی۔

[2] یہ اشارہ غالباً سر اولیور لاج کی طرف ہے جس کی Immortality اور Survival پر ''دو بڑی اہم کتب منظر عام پر آئی تھیں:

1- The Survival of Man (1909) 2- The Immortality of the Soul (1908)

اور Survival of the Fittest کی اصطلاح ہربرٹ اسپنسر نے دی تھی' ڈارون (1809-82A.D) نے نہیں۔

زندگی کی مختلف منازل کے تعارف کے سلسلہ میں قرآن حکیم کے اپنے دلائل

عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ آج یہ چیز ہمارے ہاں صرف اَنْ دیکھے ایمان کی رہی ہے' وہ لوگ اسے فلسفے کی سطح پہ' سائیکولوجی کی سطح پر' ثابت کر رہے ہیں کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں ہے' SELF (نفس) آگے چلتا ہے IMMORTALITY (حیاتِ جاوید) حاصل کرسکتا ہے۔قرآن اس کی بنیاد قرار دیتا ہے کہ انسان کی زندگی کے اندر تغیر اس ایمان سے آسکتا ہے۔اسی لیے یہ کہا کہ **وَلَمْ يَرَ الْإِنسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِن نُّطْفَةٍ فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ** [1] (36:77)۔یہ بات کہ اس کے بعد انتہا میں' آگے چل کر کیا ہوگا' یہ ٹھیک ہے کہ یہ ان کی نظروں سے اوجھل ہے' یہ تو انہیں پتہ ہے کہ ان کی اپنی تخلیق کی ابتدا کس طرح سے ہوئی تھی۔کہو کہ ان کے ہاں کا بڑے سے بڑا دانشور بھی اگر یہ چیز یوں عملاً سامنے نہ آتی' یہ کہہ سکتا تھا کہ یہاں اس جرثومۂ حیات سے کسی جنین کی ہی سمجھ لو' رحمِ مادر میں ابتدا ہوتی ہے' صرف ''وہ'' [2] اس کے سامنے ہوتا' اور کچھ نہ ہوتا' تو وہ آسمان کے تارے توڑنے والا بھی کبھی نہ کہہ سکتا کہ اس کے اندر ایک انسان پوشیدہ ہے۔پورا انسان تو اس کے' اس ایک جرثومے (نطفۂ آب) کے اندر' پوشیدہ ہوتا ہے تو ہمارے متعلق یہ کہنا کہ کل کو اگر ہم مر جائیں تو پھر اس کے بعد زندگی کیسے آئے گی' دور از کار ہے۔اس خدا کے متعلق کہنا ان سے پوچھو کہ وہاں سے زندگی کیسے آئی تھی؟ اور زندگی ہی نہیں آئی' میں نے جیسا کہا ہے' پورے کا پورا HEALTHY BABY' نہایت خوبصورت بچہ' اس کے اندر پوشیدہ ہوتا ہے۔کہا کہ ان کی یہ کیفیت ہے کہ **فَإِذَا هُوَ خَصِيمٌ مُّبِينٌ** (36:77) یہ ہمارے ساتھ جھگڑنے لگ جاتا ہے کہ صاحب! یہ تم کیسے کہہ دو گے۔کیا بات ہے! کہنے لگا کہ ان سے پوچھو کہ اس وقت اگر ہم ان سے کہتے کہ کیسے اس کے اندر سے انسان بیٹھا ہوا باہر آ جائے گا؟ تھی کوئی ان کے پاس اس قسم کی دلیل؟ کہ جو یہ کرسکتا ہے' وہ وہ کیوں نہیں کرسکتا؟ کہنے لگا کہ **وَضَرَبَ لَنَا مَثَلًا وَنَسِيَ خَلْقَهُ** (36:78) ہمارے متعلق یہ طرح طرح کی باتیں شروع کر دیتا ہے' اپنی تخلیق کو بھول جاتا ہے۔وہ دلیل یہ دیتا ہے کہ دیکھو تو سہی: **قَالَ مَن يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ** (36:78) کہتا یہ ہے کہ صاحب! یہ گوشت پھٹ جانا تو ایک طرف رہا' جب ہماری ہڈیاں تک بوسیدہ ہو جائیں گی' یہ کچھ بھی نہیں رہے گا' تو اس کے بعد پھر ہمیں زندہ کون کرسکتا ہے؟ **قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ وَهُوَ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيمٌ** (37:79) ان

---

[1] (انسان کی تو کچھ حالت ہی ایسی ہے کہ یہ اپنی حقیقت کو بھول جاتا ہے اور اپنے جذبات کی رَو میں' سرکشی اختیار کر لیتا ہے)۔وہ اس پر غور نہیں کرتا کہ ہم نے اس کی تخلیق' نطفۂ آب سے کی (جس پر اسے کوئی مقدرت نہ تھی) اور یہ پھر ہمارے ہی خلاف اُٹھ کھڑا ہوتا ہے (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ص۔1031)۔

[2] یہ اشارہ نطفۂ آب (مادہ تولید) کی طرف ہے۔

سے کہو کہ اسے وہ زندہ کرے گا جو تمہیں عدم (NOTHINGNESS) سے وجود (BEING) میں لے آیا' وہ ابھی تک موجود ہے۔اس قسم کا جو وہ خالق ہے' وہ زندہ کرے گا۔ وہ بِكُلِّ خَلْقٍ عَلِيْمٌ (37:79) جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے' جو کچھ تخلیق میں آ چکا ہے' وہ اس کے متعلق پوری طرح سے واقف ہے' جانتا ہے کہ اس کے اندر ہم نے کیا کیا POTENTIALITIES (صلاحیتیں) رکھی ہوئی ہیں۔ان میں سے کتنی اس زندگی کے اندر ACTUALIZE (بارز) ہوکر آ گئی ہیں' کتنی اور ابھی باقی ہیں۔کہا کہ اس پر ذرا غور تو کرو۔

موت کے بعد زندگی کی حرات کیسے وجود میں آئے گی' یہ کیسے ہو سکے گا؟

قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الشَّجَرِ الْاَخْضَرِ نَارًا فَاِذَآ اَنْتُمْ مِّنْهُ تُوْقِدُوْنَ (36:80)۔ عزیزانِ من! کیا بات ہے۔ وجد میں آ جاتا ہے۔ زندگی کس چیز کا نام ہے؟ حرارت کا نام ہے۔ یہ جو آپ کے ہاں دورانِ خون ہوتا ہے' CIRCULATION OF BLOOD ہوتا ہے' وہ جو ٹمپریچر دیکھتے ہیں' یہ حرارت (DEGREE OF HOTNESS) ہوتی ہے اس کا نام حرارت ہوتا ہے۔انسان مر جاتا ہے' مردہ ہوتا ہے تو اس میں حرارت نہیں رہتی' اس کا سارا ہی نظام' جتنا ہے' پھر جامد ہو جاتا ہے۔ ساری بات حرارت کی ہے۔کہا کہ یہی چیز تم کہتے ہو کہ اس کے بعد حرارت نہیں رہتی۔کہا کہ درختوں کی یہ سرسبز ٹہنیاں ہیں' کیا ان میں کہیں تمہیں حرارت نظر آتی ہے؟ یہ کس قدر عام سی مثال ہے' جو عام سا ایک دہقان بھی جانتا ہے۔ وہ بات وہاں سے شروع کرتا ہے اور فلاسفر تک پہنچا دیتا ہے۔کہا کہ کہیں اس کو ذرا تجزیہ کر کے دیکھو تو سہی' کیا اس میں کہیں حرارت کا نام و نشان ملتا ہے؟ اس کے اندر پانی ہوتا ہے' باقی چیزوں کے علاوہ نمی ہوتی ہے۔ ''گلیاں لکڑیاں تے بلدیاں وی نئیں ہیگیاں''[1]۔کہا ہے کہ کیا یہ جو سرسبز ٹہنیاں ہیں' ان میں کوئی حرارت ہوتی ہے؟ کہتا ہے کہ وہی ٹہنی جب سوکھ جاتی ہے تو کیا ہم کہیں باہر سے لا کر اس کے اندر حرارت داخل کر دیتے ہیں؟ وہ پوری کی پوری شعلہ ہوتی ہے۔ یہ آگ اس کے اندر کہاں سے آ گئی ؟ یہ اسی سبز ٹہنی کے اندر ایک تغیر ہوا ہے کہ اس کا پورا پانی حرارت بن جاتا ہے' آگ بن جاتا ہے' شعلہ بن جاتا ہے۔ بڑی خوبصورت چیز ہے' وہ اتفاق سے آ گئی۔ (مرزا اسداللہ خاں) غالب (1797-1869ء) اپنے تغزل کے انداز میں بات کر جاتا ہے' اقبالؒ (1877-1938ء) کا انداز تو فلسفیانہ ہوتا ہے۔کہتا ہے کہ

---

[1] گیلی لکڑیاں تو جلتی بھی نہیں ہیں۔

گر نگاہِ گرم فرماتی رہی تعلیمِ ضبط
شعلہ خس میں جیسے خوں رگ میں نہاں ہوجائے گا

(غالب: دیوانِ غالب)

بس یہ ہے ساری بات جو اس وقت نظر آتی ہے۔ وہ POTENTIALITY (صلاحیت) پھر اسی FORM (صورت) کے اندر آجائے گی' نہاں ہوجائے گا۔ تو سبز ٹہنی کے پانی کو جو شعلے میں تبدیل کرسکتا ہے' تمہیں جس جسم کے اندر کچھ حرارت نظر نہیں آتی' حرارت تو چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ کہا ہے کہ وہی یہ حرارت پیدا کرے گا۔

کائنات کا یہ اس قدر محیّر العقول سلسلہ' جو بالکل معدوم تھا' وہ کیسے وجود پذیر ہوا؟

پھر آگے ان سے کہو کہ اَوَلَیۡسَ الَّذِیۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضَ بِقٰدِرٍ عَلٰۤی اَنۡ یَّخۡلُقَ مِثۡلَهُمۡ (36:81) تم مانتے ہو کہ ارض وسماوات کی جو تخلیق ہوئی ہے' کوئی وقت ایسا تھا کہ یہ بالکل معدوم تھی' نہیں تھی' NON-EXISTENT تھی' یہ EXIST ہی نہیں کرتی تھی۔ کہو کہ تمہارا کوئی ذہن یہ کہہ سکتا ہے کہ کوئی چیز جو EXIST نہ کرتی ہو' وہ وجود میں آجائے بغیر کسی پہلے مسالے (MATERIAL) کے۔ تمہارا سارا فلسفہ یہاں ختم ہوجاتا ہے' تمہاری سائنس ختم ہوجاتی ہے۔ اس مقام تک جو خلق ہے' وہ تو مختلف عناصر میں تبدیلیاں پیدا کرنا ہے' مختلف ELEMENTS (عناصر) میں تبدیلیاں پیدا کرنا ہے۔ کہا کہ وہاں تک تو تم جاتے ہو۔ اس مقام پہ یہاں پہنچ جاتے ہو اور جب تم اس سے پیچھے دیکھتے ہو کہ جہاں سے یہ پہل ہوئی ہے وہ کہاں سے آ گیا؟ کہنے لگا کہ وہاں تمہارا فلسفہ ختم ہوجاتا ہے تو پھر جھگڑتے کس بات پہ ہو؟ وہاں پہنچ کر تو خود تم بے زبان ہوجاتے ہو' خاموش ہوجاتے' اعتراف کرلیتے ہو۔ سارے سائنٹسٹ یہ اعتراف کرتے ہیں کہ اس مقام پہ پہنچنے کے بعد ہم آگے کچھ نہیں کہہ سکتے' وہاں سے ہم چلتے ہیں۔

خرد مندوں سے کیا پوچھوں کہ میری ابتدا کیا ہے
کہ میں اس فکر میں رہتا ہوں' میری انتہا کیا ہے

قدرت کا قانون تخلیق

فکر یہ ہونا چاہیے کہ جو ارض وسما جیسی کائنات کو عدم سے وجود میں لے آیا' اب زیادہ سے زیادہ تم یہ کہو گے کہ یہ معدوم ہوگئی' یہ NON-BEING ہوگیا' اس میں وہ چیز نہیں رہی۔ کہنے لگے کہ جب کچھ نہ تھا' تو اتنا کچھ بن گیا' اب تو فرض کرو' جیسا تم کہتے ہو' کہ یہ نہیں رہی' مثلھم' تو اس کی مثل بنا دینا ہمارے لیے کیا مشکل ہے؟ کہا کہ بَلٰی وَهُوَ الۡخَلّٰقُ الۡعَلِیۡمُ (36:81)۔ کیوں

نہیں! وہ خدا ہر قسم کی تخلیق پر قادر ہے اور ہر شے کا علم رکھتا ہے۔ یہاں خَـلّٰـقُ کہا ہے کہ ''ایسی چیزیں کر دینے والا جو تمہارے ذہن میں نہ آ سکیں اس قسم کی تخلیق کرنے والا''۔ اور علیم وہی چیز ہے کہ وہ علم کے سہارے یہ کچھ کرتا ہے۔ آگے کہا کہ اِنَّـمَـآ اَمۡـرُهٗۤ اِذَآ اَرَادَ شَيۡـئًا اَنۡ يَّقُوۡلَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ (36:82) اسے تخلیق کے لیے کہیں سے کوئی مسالہ (MATERIAL) مانگ کر لانا نہیں پڑتا۔ اس کا قانونِ تخلیق یہ ہے کہ جب وہ کسی شے کو پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو اس ارادے کے ساتھ ہی اس شے کی تخلیق کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ اسے یوں سمجھیے کہ کہنے لگے کہ وہ جو اس کا پلان ہے' اس پلان کی کیفیت یہ ہے کہ جب وہ کسی چیز کے متعلق طے کر لیتا ہے' اس کے بعد اس کو پھر ضرورت نہیں ہوتی کمہار کی طرح وہ دیکھے کہ میرے پاس وہ مٹی کا تودہ ہے یا نہیں' چاک ہے یا نہیں' وہ ان چیزوں کو عدم سے وجود میں لے آتا ہے۔ جب وہ شے عالمِ امر سے عالمِ خلق میں آ جاتی ہیں' پھر تمہاری سائنس وہاں سے شروع ہوتی ہے۔ تو تمہاری یہ سائنس یہاں سے شروع ہوتی ہے وہاں جب آخر میں جا کر تم پہ موت آ جاتی ہے' تو وہاں سے پھر تمہاری سائنس ختم ہو جاتی ہے۔

کارخانہ قدرت کے متعلق ایمان کی پختگی کے معاملے میں ہماری اپنی حالت

یہ سیدھی سی بات ہے کہ ابتدا میں بھی تمہاری سائنس ختم ہوتی ہے' یہاں پہنچ کر (مرنے کے بعد) بھی تمہاری سائنس ختم ہو جاتی ہے مگر انسان نہیں ختم ہوتا۔ عزیزانِ من! دین کی یہ جو ساری لم ہے' یہ اس ایمان پر ہے۔ اور یہی ایمان آج کہیں نظر نہیں آتا۔ بڑے زور سے کہتے ہیں:

یہ تیرے مومن و کافر' تمام زناری
نہ دیر میں نہ حرم میں خودی کی بیداری

(اقبال: ضربِ کلیم)

دین کی یہ ساری لم کہیں نظر نہیں آتی۔ غیر مسلموں سے بہر حال کیا شکوہ' وہاں تو یہ قرآنِ کریم ہے نہیں' ہم جو روز اپنے ایمان کو دہراتے رہتے ہیں' ذرا دیکھیے تو سہی' دوسروں کو کیا دیکھنا' اپنے ہی سینے میں ذرا جھانک کر دیکھیے کہ ہے ایمان اس بات پر؟ نہیں' قطعاً نہیں۔

قدرت کی طرف سے کائنات کا ذرہ ذرہ قانون کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے

کہا ہے کہ فَسُبۡحٰنَ الَّذِىۡ (36:83) یہ جو تم تصور کرتے ہو کہ نہیں! جب یہ مر گیا اور اس کے بعد وہ اس کو پیدا نہیں

کرسکتا' کہنے لگا وہ تمہارے ان ناقص تصورات سے بہت ماورا ہے' بہت اونچا ہے' بہت بلند ہے بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ (36:83) ہر شے کا اقتدار اس کے ہاتھ میں ہے' اس کا اقتدار INFINITE (لانہتا) ہے' اس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتے کہ وہ کتنا ہے۔ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (36:83) اس کے قانون کی طرف ہر شے رجوع کرتی چلی جارہی ہے' اور یہ کچھ اس کے قانون کے مطابق ہوجائے گا۔ زندگی' زندگی کے بعد کی زندگی' مکافاتِ عمل کا ظہور' وہاں ہر شے' ہر ارادے کا نتیجہ وہاں ہے۔ یہاں ایک نظام کی صورت میں یہ نظام قائم ہوگا تو پھر یہاں یہ ہوگا کہ نہ کوئی بے گناہ کسی طرح سے بھی گرفت میں آ کر اسے کسی بھی قسم کی کوئی اذیت ہوگی' نہ کوئی گناہ گار یا جو جرائم والا ہے' اس کا جو جرم ہے' کسی طرح سے وہ اسے چھپا سکے گا۔ خدا کا نظام اسی دنیا کے اندر قائم ہوگا جسے خدا کی بادشاہت کہا جاتا ہے وہ یہاں ہوگی۔ افراد کی یہ صورت ہوگی اور اگر یہاں یہ نظام نہ قائم ہوگا' آگے چلو گے' زندگی ختم نہیں ہوگی:

''زندگی جوئے رواں است ورواں خواہد بود''

یہ تو ایک بہنے والی ندی ہے اسے تو بہے چلے جانا ہے

''ایں مئے کہنہ جواں است جواں خواہد بود''

عزیزانِ من! کیسی خوبصورت تمثیل ہے! کہ یہ شراب جتنی پرانی ہوگی' اتنی ہی تیز ہوگی۔ آگے بڑھ کر تو زندگی اور زیادہ تیز ہوجاتی ہے۔ لہٰذا فَسُبْحٰنَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ وَّاِلَیْہِ تُرْجَعُوْنَ (36:86)۔ وہ خدا جس کے قبضۂ قدرت میں تمام اشیائے کائنات کی حکمرانی ہے' اس تصور سے کس قدر دور اور بلند ہے کہ وہ انسان کی موت کے بعد زندگی کو جاری رکھنے پر قادر نہیں ہوسکتا۔ یاد رکھو! جس طرح خدا کا اقتدار تمام اشیائے کائنات کو محیط ہے' اسی طرح اس کا قانونِ مکافات انسان کے اعمال کو بھی مہیمن (نگران) ہے اور تمہارا ہر قدم اسی کی طرف اُٹھ رہا ہے۔ اس زندگی میں بھی اور اس کے بعد کی زندگی میں بھی..... تمہارا کوئی عمل بلا نتیجہ نہیں رہ سکتا۔ خواہ وہ نتیجہ اس زندگی میں سامنے آئے یا اس کے بعد' حیاتِ اُخروی میں۔ یہی دین کی اصل ہے۔

عزیزانِ من! آج سورۃ یٰس ختم ہوگئی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے، وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے، وہ میرے ذہن کی نارسائی۔ (پرویز۔۔معراجِ انسانیت)